مجلہ

الواقعۃ

کراچی

إِذَا وَقَعَتِ الْوَاقِعَةُ ۝١ لَيْسَ لِوَقْعَتِهَا كَاذِبَةٌ ۝٢

"جب قیامت قائم ہو جائے گی۔ جس کے وقوع پذیر ہونے میں کچھ شبہ نہیں۔" (سورۃ الواقعۃ)

۱۳۳ محرم الحرام ۱۴۴۷ھ / جون و جولائی ۲۰۲۵ء



- غزہ پر صہیونی مظالم
- سورۃ العصر: نکات و افادات
- امن میں جنگ کی تیاری، قوم کی مکمل بیداری

مجلہ
الواقعہ
کراچی

إِذَا وَقَعَتِ الْوَاقِعَةُ، لَيْسَ لِوَقْعَتِهَا كَاذِبَةٌ

"جب قیامت قائم ہو جائے گی، جس کے وقوع پذیر ہونے میں کچھ شبہ نہیں۔"

سلسلہ نمبر: ۱۳۳، محرم الحرام ۱۴۴۷ھ/ جون و جولائی ۲۰۲۵ء

آئینہ مضامین

نور قرآن	تفسیر سورہ فاتحہ (۵)	مولانا حکیم عبد الخبیر صادق پوری	۲
اداریہ	جلال الدین، فتنہ تاتار اور اہل غزہ	محمد تنزیل الصدیقی الحسینی	۴
قرآنیات	تفسیر سورۃ العصر	مولانا ابو الکلام آزاد	۵
❁	جہاد میں رسول اللہ ﷺ کا اسوہ	مولانا محمد جمیل اختر جلیلی ندوی	۸
❁	خدا اور مذہب اور ملحدوں کے مغالطے	ڈاکٹر حبیب احمد خان	۱۲
❁	سرزمین شام؛ فضائل و برکات	شیخ کرم الٰہی	۱۶
❁	امن میں جنگ کی تیاری	محمد تنزیل الصدیقی الحسینی	۲۲
❁	طبل جنگ	ابو عمار سلیم	۲۵
❁	غزہ بطور ایک "نیکرو پولیٹکل" زون	ثقلین امام	۲۸
❁	سلیم احمد صدیقی	محمد تنزیل الصدیقی الحسینی	۳۰
❁	یادِ رفتگاں	محمد تنزیل الصدیقی الحسینی	۳۴
❁	اسلام اور عیسائیت کی کشمکش	مولانا طلحہ نعمت ندوی	۳۶
❁	تبصرہ کتب	محمد تنزیل الصدیقی الحسینی	۳۸

مدیر
محمد تنزیل الصدیقی الحسینی

ادارتی معاونین
ابو عمار سلیم
ابو موحد واصف العباسی
ڈاکٹر محمد مشہود احمد
حافظ محمد ریحان
توصیف احمد خان
محمد ساجد صدیقی

قیمت فی شمارہ
100 روپے

برائے رابطہ : 0300-2277551 ، 0333-3738795
ای-میل : mujalla.alwaqia@gmail.com
ویب ایڈریس: alwaqiamagzine.wordpress.com
فیس بک: https://www.facebook.com/AlWaqiaMagazine/

مولانا حکیم عبد الخبیر جعفری صادق پوری رحمہ اللہ
تسہیل و ترتیب: محمد تنزیل الصدیقی الحسینی

قسط: (۵)

تشریح سورہ فاتحہ

مٰلِكِ يَوْمِ الدِّيْنِ (ترجمہ) ''وہ انصاف کے دن کا مالک ہے۔''

اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے اپنی چوتھی صفت مٰلِكِ يَوْمِ الدِّيْنِ بیان کیا۔ اب سمجھنا یہ ہے کہ مٰلک یوم الدین کیا چیز ہے؟ مالک کے معنی اختیار رکھنے کے ہیں اور یوم الدین کا معنی انصاف کا دن۔ قرآن مجید میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے:-

يَوْمَ لَا تَمْلِكُ نَفْسٌ لِّنَفْسٍ شَيْـًٔا ۖ وَالْاَمْرُ يَوْمَئِذٍ لِّلّٰهِ (الانفطار: ۱۹)

یہ قیامت کی تعریف ہے جو اللہ تعالیٰ نے یوں بیان کی ہے کہ ''اس دن کوئی نفس کسی نفس کے متعلق کوئی اختیار نہیں رکھے گا۔ اس کا کام بالکلیہ اللہ تعالیٰ کے اختیار میں ہوگا۔''

دین کا لفظ قرآن مجید میں مختلف جگہوں پر استعمال ہوا ہے اور ہر جگہ پر ایک ہی معنی میں استعمال نہیں ہوا ہے۔ عرب بولتا ہے: دناھم کما دانوا یعنی ہم نے ان کے ساتھ ویسا ہی برتاؤ کیا جیسا انھوں نے میرے ساتھ کیا۔ تو اب یوم الدین کا مطلب یہ ہوا کہ جیسا برتاؤ لوگوں نے کیا ہے ان کے برتاؤ کے مطابق پورا پورا بدلہ سزا یا جزا کے طور پر برتاؤ کیے جانے کا دن یوم الدین ہے۔ نہ سزا میں کوئی زیادتی اور نہ جزا میں کچھ کمی ہونے والی ہے۔ یہ عقیدہ کہ جیسا انسان کر رہا ہے اس کو ویسا ہی بدلہ ایک دن ملنا ہے۔ ہر مذہب کے اندر یہ عقیدہ پایا جاتا ہے۔ جس شخص کا یہ عقیدہ جتنا ہی مضبوط ہے اتنا ہی اس کی مذہبی حالت درست ہے۔ اگر اس عقیدہ کا بالکل فقدان ہو تو بالکلیہ مذہب باقی نہیں رہتا اور اگر اس عقیدہ میں کمزوری ہو تو جتنی بھر کمزوری ہوگی اتنا ہی اس کے مذہبی حال میں خرابی ہے۔ شاید اسی عقیدہ کے فقدان یا کمزوری کی طرف اشارہ کرنے کے لیے شاعر نے کہا ہے:-

نہ ہندوام نہ مسلمان نہ کافر نہ یہود بحیرتم کہ سر انجام من چہ خواہد بود

حقیقت یہ ہے کہ جب قیامت کا عقیدہ بالکل نہ ہو تو پھر کسی مذہب کا دعویٰ صحیح نہیں ہو سکتا۔ بہت سے لوگ ایسے ہیں کہ نہ اللہ کو مانتے اور نہ قیامت کو مانتے ان کا ذکر ہی کیا۔ جو لوگ اس عقیدہ کا اپنے کو قائل بتاتے ہیں وہ اللہ تعالیٰ کے اس کلام کی طرف توجہ کریں:-

وَاَمَّا مَنْ خَافَ مَقَامَ رَبِّهٖ وَنَهَى النَّفْسَ عَنِ الْهَوٰى (۴۰) فَاِنَّ الْجَنَّةَ هِيَ الْمَاْوٰى (النازعات: ۴۰-۴۱)

یعنی: جنت کا ٹھکانا ان لوگوں کے لیے ہے جو قیامت میں اللہ تعالیٰ کے سامنے کھڑے ہونے سے ڈرتے ہیں اور اس ڈر کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ وہ اپنے نفس کے خواہشات پر پابندی عاید کرتے ہیں تو خلاصہ یہ ٹھہرا کہ قیامت کو ماننے والا اس کا نفس جدھر لے جائے ادھر جانے کے لیے تیار نہیں ہوگا۔

سورہ بقرہ کے پہلے رکوع میں متقین کی تعریف میں اللہ تعالیٰ نے چند چیزوں پر ایمان رکھنے کی شرط بیان کی اور آخرت پر یقین کے درجے کی شرط لگا دی۔ تفسیر میں جانے کا تو موقع نہیں ہے لیکن اتنا بتانا چاہتے ہیں کہ ایمان اور یقین دونوں کا معنی ایک نہیں ہے۔ ایمان سے یقین کا درجہ بہت اونچا ہے۔

جناب رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ہے کہ چوری کرنا والا جس وقت چوری کرتا ہے اس وقت مومن نہیں رہتا۔ زنا کرنے والا جس وقت زنا کرتا ہے اُس وقت مومن نہیں رہتا۔ خلاصہ یہ ہے کہ اس قسم کے کبیرہ گناہ بھی سرزد ہو رہے ہوں اور پھر ایمان بھی باقی ہو یہ دونوں باتیں اکٹھی نہیں ہو سکتیں۔ ایمان ہے تو ایسے کبیرہ گناہ نہیں ہو سکتے اور اگر ایسے کبیرہ گناہ کا ارتکاب ہو رہا ہے تو پھر ایمان باقی نہیں رہتا۔ جب ایمان کا یہ حال جناب رسول اللہ ﷺ فرماتے ہیں تو آخرت پر یقین رکھنے والے کا درجہ تو اس سے بھی اونچا ہے۔ گناہوں اور نفسانی خواہشات سے نہ بچنے والا آخرت پر یقین رکھنے کا دعویٰ کیونکر کر سکتا

ہے۔[①] قیامت یقینی آنے والی ہے۔ کیا واقعہ عقلِ سلیم اس کو تسلیم کرتی ہے۔ اس کے متعلق حضرت علی رضی اللہ عنہ سے پوچھا گیا تھا کہ آپ کیسے مانتے ہیں کہ اللہ ہے اور قیامت ہونے والی ہے۔ اس کے جواب میں انھوں نے مختصر جواب یہ دیا تھا کہ ہم نے اس کو انسان کی کمزوری سے سمجھا ہے۔ اس کی تشریح میری ناقص رائے میں یوں ہے کہ ایک بات جو تمام انسانوں کی مانی ہوئی ہے کیا اگلے کیا پچھلے کیا مذہبی کیا غیر مذہبی یعنی ملحد اور دہریے سب ہی مانتے ہیں کہ عدل و انصاف ایک اچھی چیز ہے اور بے انصافی بری چیز ہے اس لیے تمام دنیا میں ہمیشہ سے رہا اور آج بھی ہے کہ عدل کے لیے عدالتیں کھولی گئیں ہیں اور بھی انسان کا مانا ہوا مقولہ ہے کہ جو جیسا کرے اس کو ویسا پانا چاہیے۔ مگر اگر غور کیجیے تو دنیا اس کے پورا کرنے سے قاصر رہی ہے اور ہے۔ دنیا کے بڑے بڑے قانون داں بلکہ فلسفہ قانون کے جاننے والے کہتے ہیں کہ عدالت کی کرسی پر بیٹھنے والے کو اپنے خیالات کو ہر طرح سے پاک و صاف کر کے عدل کرنے کی کوشش کرنی چاہیے۔ لیکن عدل ہوتا ہے یا نہیں اس میں انسان مجبور ہے۔ ہر طرح کی خیالات کی صفائی کے ساتھ بھی اور ہر قسم کے عیوب سے مبرا ہونے پر بھی اس کا فیصلہ صحیح ہوتا ہے کبھی غلط ہوتا ہے۔ یہ ان کا حال ہے جو عدل چاہتے ہیں۔ ان کا کیا پوچھنا ہے جو رشوت یا بے جا جانب داری کی وجہ سے قصداً فیصلہ غلط کرتے ہیں۔ دنیا کے عقلا کی رائے آپ سن چکے۔ اب ذرا اس طرف توجہ کیجیے کہ جناب رسول اللہ ﷺ کیا فرماتے ہیں اور اس کو بھی مدنظر رکھیے کہ آپ ﷺ کی ذات ستودہ صفات ہر قسم کے عیوب سے پاک ہے، جن میں بہت سے فیصلہ کرنے والے مبتلا ہوتے ہیں۔ لیکن پھر بھی آپ ﷺ فرماتے ہیں کہ ہم روئداد اور لوگوں کے بیان پر فیصلہ دیتے ہیں بخوبی ممکن ہے کہ میرا فیصلہ غلط ہوا ہو اس لیے جس کے حق میں میں نے فیصلہ دیا ہو وہ اس کو اپنا حق نہ سمجھے کیوں کہ میرے فیصلے کی پھر اللہ کے یہاں اپیل ہوگی اور حق حق دار کو دلوایا جائے گا۔[۲] دنیا کے عقلا کی رائے آپ سن چکے اور مذہبی دنیا کے سرتاج جناب رسول اللہ ﷺ کا مقولہ آپ کو معلوم ہو چکا کیا اس سے یہ چیز ثابت نہیں ہوتی ہے کہ دنیا اپنے ماحول کے ساتھ عدل اور انصاف سے قاصر ہے۔ پھر عدل اور انصاف کیا ٹھہرا؟ کیا ایک عَنقا ہے؟ اگر حقیقی عدل کا کوئی دن نہیں آنا ہے تو عدل کا نام لینا ہی بالکل بیکار ہے تب وہی ٹھیک ہے جس کے ہاتھ میں لاٹھی اسی کی بھینس۔

میری ناقص رائے تو یہ ہے کہ دنیا ہر شخص کے کرتوت کا صحیح بدلہ دینے سے قاصر ہے نہ کسی شخص کو کماحقہ جزا دے سکتی ہے نہ سزا۔ اگر کماحقہ جزا یا سزا کا دن نہ آئے تو یہ کام ادھورا رہ جاتا ہے۔ ایک شاعر کہتا ہے:-

بہت سے گوہر شہوار ایسے بھی ہوئے ہوں گے
کہ جن کی خوبیاں سب مٹ گئیں تہ میں سمندر کے

شاعر کے کہنے کا مطلب یہ ہے کہ تھوڑے سے موتی مثلاً کوہ نور وغیرہ جو بادشاہوں کے تاج میں لگائے گئے یا ہار میں پروئے گئے ویسے ویسے موتی سمندر میں بہت سے پڑے رہ گئے کہ جن کو نہ تاج میں ٹکنا نصیب ہوا نہ ہار میں پرویا جانا نصیب ہوا۔ یہ ایک تمثیل ہے کہ دنیا میں ایسے بہت سے لائق لوگ گزرے یا گزر رہے ہیں جن کی لیاقت کا صحیح پھل دنیا نہیں پیش کر سکی۔ ان کے فعل یا عمل یا محنت کا نتیجہ دنیا میں نہیں مل سکا۔ یہ تو ان کے جزا کا حال ہے۔

اب سزا کی طرف توجہ کیجیے کہ بڑے بڑے قصور وار بڑے بڑے شریر ایسے ہوتے رہے ہیں اور ہیں کہ ان کے برے کرتوت کی سزا دنیا نہیں کر سکی۔ اس لیے عقل کو تسلیم کرنا چاہیے کہ کماحقہ حقیقی جزا یا سزا کا وقت آنا ضرور ہے۔

بعض صورت تو ایسی ہوتی ہے کہ قصوع وار پکڑا بھی گیا اور عدالت میں پیش بھی ہوا۔ عدالت نے واقعہ عدالت بھی کیا قصور کی حقیقت اس پر منکشف بھی ہوئی لیکن پھر بھی قصور کے مطابق اس کا بدلہ عدالت نہیں دے سکی۔

بقیہ صفحہ ۳۳ پر ملاحظہ کیجیے

① فاضل مفسر نے یہاں ایمان بمقابلہ یقین کی بات کی ہے، کیوں کہ یقین کا درجہ ایمان سے بلند ہے۔ یہاں مطلقاً ایمان کی نفی مراد نہیں ہے۔ (تنزیل)

۲ معنوی اعتبار سے یہ حدیث متعدد کتب حدیث میں موجود ہے۔ جیسے صحیح مسلم میں ہے:-

زینب بنت ابی سلمہ رضی اللہ عنہا نے ام المومنین حضرت ام سلمہ رضی اللہ عنہا سے روایت کی کہ رسول اللہ ﷺ نے اپنے حجرے کے دروازے پر جھگڑنے والوں کا شور و غوغا سنا، آپ ﷺ باہر نکل کر ان کی طرف گئے اور فرمایا: "میں ایک انسان ہوں اور میرے پاس جھگڑا کرنے والے آتے ہیں، ہوسکتا ہے ان میں سے کوئی دوسرے سے زیادہ زبان آور ہو، میں سمجھوں کہ وہ سچا ہے اور میں اس کے حق میں فیصلہ کر دوں۔ میں جس شخص کے حق میں کسی (دوسرے) مسلمان کے حق کا فیصلہ کر دوں تو وہ آگ کا ایک ٹکڑا ہے، وہ چاہے تو اسے اٹھا لے یا چاہے تو چھوڑ دے۔" (صحیح مسلم، کتاب الأقضیۃ، باب: بیان ان حکم الحاکم لا یغیر الباطن)- (تنزیل)

درسِ آگہی

محمد تنزیل الصدیقی الحسینی

جلال الدین، فتنہ تاتار اور اہل غزہ!

تاریخ کے اوراق عبر و نصائح سے بھرے پڑے ہیں۔ یہ کبھی عبرت کے اسباق پڑھاتے ہیں کہ ہم ڈریں اور سنبھل جائیں اور کبھی کامیابی کی راہ دکھاتے ہیں کہ ہم انتخاب کریں اور اپنے حصے کی کامیابی حاصل کریں۔

تاریخ ہمیں یہ بھی بتاتی ہے کہ ہر جنگ جیتنے کے لیے نہیں لڑی جاتی۔ ہر مزاحمت کا نتیجہ کامیابی نہیں ہوتا۔ کبھی ایک نسل ہارتی ہے تاکہ دوسری جیت سکے۔ کوئی موت کو گلے لگاتا ہے تاکہ دوسرا زندگی پا سکے۔

جلال الدین خوارزم شاہ اسلامی تاریخ کا ایک مظلوم کردار ہے۔ جسے اس کا جائز مقام نہیں دیا گیا۔ شاید اس لیے کہ تاریخ کے صفحات پر فتح کے شادیانے جس زور سے بجائے جاتے ہیں قربانی کی داستانیں اتنی گداز نہیں ہوتیں کہ دل پر اثر چھوڑ جائیں۔ یا شاید اس لیے کہ انسان قربانی کی بجائے کامیابی کو زیادہ پسند کرتا ہے۔

جلال الدین قربانی کی مثال ہے اور لوگوں کو کامیاب ہونا پسند ہے۔ قربانی دینے والے لوگ اچھے لگتے ہیں لیکن خود قربانی دینا ایک مشکل کام ہے۔

جلال الدین واحد مسلمان کمانڈر ہے جس نے چنگیز خان کو میدانِ جنگ میں شکست دی۔ فتنہ تاتار کے سامنے بنیان مرصوص بن گیا۔ جلال الدین کی سلطنت باقی نہیں رہی۔ اس کی فوج منتشر ہوگئی۔ اور اس وقت کی پوری ملت اسلامیہ اسی کے درپے آزار ہوئی۔ خلیفہ اسلامی نے منہ پھیر لیا اور کوئی مسلم حکمران مدد کے لیے آمادہ نہ ہوا لیکن جلال الدین نے ہمت نہ ہاری۔ چنگیز خان نے اس سے سب کچھ چھین لیا مگر اس کی ہمت اور اس کا سر نہ لے سکا۔

کہتے ہیں کہ اگر فتنہ تاتار کے مقابلے میں جلال الدین نے یہ مزاحمت نہ کی ہوتی تو تاتاری فتنے کو جزیرۃ العرب میں داخل ہونے سے اور حرمین مقدس میں داخل ہونے سے روکنا تقریباً ناممکن ہوتا۔ جلال الدین چلا گیا اور خوارزم شاہی سلطنت کا خاتمہ ہوگیا۔ اس کے بعد تاتاریوں کی راہ آسان ہوگئی۔ اسلامی زمینوں پر تاتاری پرچم لہرانے لگے۔ ہلاکو خاں نے بغداد کی اینٹ سے اینٹ بجا دی اور عباسی خلیفہ کو گھوڑوں کی سموں سے روندا گیا۔ یہ منگول جہاں گئے دہشت و درندگی کی علامت بن گئے۔ انسانی کھوپڑیوں کے مینار بناتے اور تہذیب و تمدن کے نقوش مٹاتے بڑھتے چلے گئے۔ لیکن جلال الدین کا ایثار ہی تھا کہ وہ جزیرۃ العرب میں داخل نہ ہو سکے۔ حرمین شریفین بھی ان کے زیر تغلب آنے سے محفوظ رہا اور بیت المقدس بھی سلامت۔

تاریخ کا سفر آج بھی جاری ہے۔ کرداروں کے نام بدل گئے ہیں مگر جوہری رویے میں کوئی فرق نہیں آیا۔ آج کے منگولوں نے درندگی و بہیمیت کی نئی منزلیں سر کی ہیں۔ ایسے مہلک ترین ہتھیار تیار کیے ہیں کہ آن واحد میں بستیوں کی بستیاں تباہ کر رہے ہیں۔ لیکن آج جلال الدین ایک فرد نہیں رہا، بلکہ ایک نظریہ بن کر اہلِ غزہ کے دلوں میں دھڑک رہا ہے؛ اور ملت اسلامیہ کا کردار آج بھی وہی ہے جو جلال الدین کے ساتھ تھا۔

اہل غزہ آج نہیں تو شاید کل مٹ جائیں اور یہ بھی ممکن ہے کہ توفیق الٰہی سے وہ اپنی جگہ ڈٹے رہیں اور اسرائیل اپنی تمام تر کوششوں کے باوجود انھیں صفحہ ہستی سے مٹا نہ سکے تاہم وہ اگر مٹ بھی گئے تو پورے وقار کے ساتھ تاریخ کے بابِ عزیمت میں جگہ پائیں گے۔ فتنہ تاتار نہ کل رکا تھا اور نہ ہی آج صرف فلسطین پر اکتفا کرے گا۔ اسرائیل کے اہداف خود ان کے لیے متعین ہیں؛ خواہ ہم اس سے بے خبر ہوں اور صرفِ نظر کریں۔ اسرائیل اپنے اگلے ہدف کے لیے قدم ضرور بڑھائے گا۔

جلال الدین کا ساتھ نہ دینے کی جو سزا ملت اسلامی کو ملی تھی اب زیادہ دور نہیں کہ اہل غزہ کا ساتھ نہ دینے کی سزا امت اسلامی کو ملے۔ اگر مدد کے لیے پکارتے ہوئے معصوم بچوں کی چیخ و پکار بھی ملت اسلامیہ میں غیرت وحمیت کی رمق نہ جگا سکے تو وہ سزا کی ہی مستحق ہے۔ گو سننے یا پڑھنے میں یہ اچھا نہ لگے۔ کہتے اور لکھتے ہوئے دل آمادہ نہ ہو؛ مگر حقیقت یہی ہے۔ یہی تاریخ کا فلسفہ بھی ہے اور یہی سنت تقدیر الٰہی بھی۔

جب مسلمان متحد ہوں گے تو بیت المقدس بھی حاصل کر لیں گے اور فاتح بھی بن جائیں گے لیکن تب تک کے لیے اپنے عہد کے فتنہ تاتار کا سامنا کریں؛ جو گزشتہ سے کہیں بڑھ کر بے رحم بھی ہے اور خوں آشام بھی!!

مولانا ابو الکلام آزاد

مرتب: محمد تنزیل الصدیقی الحسینی

تفسیر سورۃ العصر

سورۃ العصر کے تفسیری نکات سے متعلق مولانا آزاد کی جو تحریری منتشر و متفرق ہیں یہاں انھیں با حوالہ یکجا کیا گیا ہے۔

①

وَالْعَصْرِ (۱) اِنَّ الْاِنْسَانَ لَفِيْ خُسْرٍ (۲) اِلَّا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ وَتَوَاصَوْا بِالْحَقِّ وَتَوَاصَوْا بِالصَّبْرِ (۳)

"قسم ہے اس عصر انقلاب اور دور تغیرات کی، جو پچھلے دور کو ختم کرتا، اور نئے دور کی بنیاد رکھتا ہے، کہ نوعِ انسانی کے لیے دنیا میں نقصان و ہلاکت کے سوا کچھ نہیں۔ مگر ہاں وہ نفوسِ قدسیہ، جو قوانینِ الٰہیہ پر ایمان لائے، اعمالِ صالحہ اختیار کیے، ایک دوسرے کو امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کے ذریعہ دینِ حق کی وصیت کرتے رہے، اور نیز صبر و استقامت کی بھی انھوں نے تعلیم دی۔"

(الہلال؛ ۱۲ نومبر ۱۹۱۳ء)

②

اسلام ایک مکمل مذہب کے تمام اجزاء کا مجموعہ ہے، اس لیے اس نے عقائد و عبادات کے سلسلہ میں اخلاق کو بھی نمایاں جگہ دی ہے۔ لیکن اسلام نے مسلمانوں کو خاص طور پر جن اخلاقِ حسنہ کی تعلیم دی، وہ تمام تر فوجی گروہ سے تعلق رکھتے ہیں۔ اس نے صبر و توکل اور عزم و استقلال کی ہر موقع پر تعلیم دی، اور یہی چیزیں ہیں جن کے ذریعہ سے کوئی فوج میدانِ جنگ میں ثابت قدم رہ سکتی ہے۔ اسلام دنیا میں حق و صداقت کی اشاعت کے لیے آیا تھا، لیکن حق و صداقت کا میدان صرف جہاد ہی کے ذریعہ سے فتح ہو سکتا تھا، اور صبر جہاد کی حقیقت کے لیے اصلی شرط ہے، پس اس نے ہمیشہ حق و صبر کو لازم و ملزوم قرار دیا:-

وَالْعَصْرِ (۱) اِنَّ الْاِنْسَانَ لَفِيْ خُسْرٍ (۲) اِلَّا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ وَتَوَاصَوْا بِالْحَقِّ وَتَوَاصَوْا بِالصَّبْرِ (۳)

"زمانہ اور اس کے حوادث و نتائج شاہد ہیں کہ انسان کی قوتیں اور انسان کے تمام اعمال بڑے ہی گھاٹے ٹوٹے میں رہتے ہیں اور صرف وہی انسان کامیاب ہوتے ہیں جنھوں نے اپنے اندر یقین پیدا کیا، اور اپنے اعمال کو صالح رکھا، نیز باہم حق کی وصیت کی اور صبر کی طرف ایک دوسرے کو بلایا۔"

(البلاغ؛ ۱۱ فروری ۱۹۱۶ء)

③

قرآن نے ایمان اور اہل ایمان کی نسبت جو کچھ کہا ہے اس میں کوئی بات بھی اس قدر نمایاں نہیں جس قدر یہ کہ خوف اور غم دونوں سے محفوظ ہو جائیں گے۔ حقیقت یہی ہے کہ انسانی زندگی کی سعادت کے لیے اس سے زیادہ کچھ نہیں کہا جا سکتا۔ اس کی شقاوت کی ساری سرگزشت ان ہی دو لفظوں میں سمٹی ہوئی ہے؛ خوف اور دکھ۔ جوں ہی ان دو باتوں سے رہائی مل گئی، ساری سعادتیں اس کے قبضے میں آ گئیں۔ قرآن نے یہ حقیقت دوسرے پیرائے میں بھی بیان کی مثلاً سورہ عصر اسی حقیقت کا اعلان ہے۔

(تفسیر ترجمان القرآن، جلد ۲، ص: ۱۸۲)

④

میں دنیا کی تمام قوموں سے قطع نظر کر لیتا ہوں، اور مسلمانوں کو دکھانا چاہتا ہوں کہ جب کہ وہ دنیا کے طرح طرح کے اعلانات کی پرستش کر رہے ہیں، ان کو یاد کرنا چاہیے کہ ان کے پاس ایک الہامی اعلان ہے، جب تک وہ اس تعلیم کو اپنے سامنے نہ لائیں گے، ان کی کامیابیاں سودمند نہیں ہوسکتیں۔ وہ وہ ہے جس کا اعلان قرآن نے جا بجا کیا ہے، وہ ایک مختصر سبق ہے کہ جس کو دہراتے ہوئے خاص طور سے میں خطاب کروں گا اپنے مسلمان بھائیوں سے اور ہندو بھائیوں سے التجا کروں گا کہ وہ خاص اصطلاح سن کر کبیدہ خاطر نہ ہوں، بلکہ اس حقیقت کو ڈھونڈیں کہ جس طرح بہت سے شیشے میں کنول ہیں، مگر روشنی ایک ہے۔ سرخ رنگ سے روشنی سرخ نہیں ہوسکتی۔ خدا کی سچائی ایک ہے، اگرچہ طرح طرح کے ناموں میں پیش کی جائے۔ میں یقین دلانا چاہتا ہوں کہ دنیا میں کوئی چھوٹی چھوٹی سے کامیابی بھی، دنیا کو کوئی وجود، کوئی روح، کوئی آتما، خدا کا کوئی ذرہ اس آسمان کے نیچے کامیابی نہیں پا سکتا جب تک وہ اس پروگرام پر عمل نہ کرے جو اس نے دنیا کے سامنے پیش کیا ہے۔ اگرچہ قرآن نے اس بارہ میں نہایت تفصیلی بیانات دیے ہیں لیکن ایک نہایت چھوٹا بیان ہے جس کی نسبت تاریخ اسلام کے ایک بہت بڑے امام نے جن کا نام امام شافعی ہے، یہ کہا تھا کہ اگر قرآن کے یہ چند جملے نازل ہو جاتے تو تمام کرۂ ارضی کی ہدایت کے لیے کافی تھے۔

وَالْعَصْرِ (۱) اِنَّ الْاِنْسَانَ لَفِيْ خُسْرٍ (۲)

آپ مقصد اور مراد کے ڈھونڈنے والے ہیں، آپ مقصد کے عشق میں آنسو بہانے والے ہیں، تو میں پوچھنا چاہتا ہوں کہ قرآن کا ہر اچھے مقصد کے لیے یہ اعلان ہے کہ اس آسمان کے نیچے، نوع انسان کے لیے، انسانوں کی تلاشوں کے لیے، جستجوؤں کے لیے، امیدوں کے لیے بڑی بڑی ناکامیاں ہیں،

بڑے بڑے گھاٹے ٹوٹے ہیں۔ لیکن دنیا کی اس عام نامرادی سے کون انسان ہے، کون جماعت ہے کہ جو بچ سکتی ہے۔ اور ناکامیابی کی جگہ کامیابی پا سکتی ہے۔ ناامیدی کی جگہ امید اس کے دل میں اپنا آشیانہ بنا سکتی ہے۔ وہ کون انسان ہیں؟ وہ انسان کہ جو دنیا میں ان چار شرطوں کو قولاً وعملاً یعنی جہاں جتنا تعلق، دھیان اور سوچ بچا رکا ہے، وہاں ان چار شرطوں کو اپنے اندر پیدا کر لیں۔ جب تک یہ پیدا نہ ہوگی اس وقت تک دنیا میں نہ کوئی قوم کامیاب ہو سکتی ہے، اور نہ ملک، حتیٰ کہ ہوا میں اڑنے والے پرند بھی دنیا میں کامیابی نہیں پا سکتے۔ ان چار شرطوں کے نام سے گھبرا نہ جانا۔ اگر ایک چیز عربی بھیس میں آجائے، تو کیا تم انکار کردو گے، چاہے وہ پہچانی ہوئی ہو۔ پہلی شرط وہ ہے، جس کا نام قرآن مجید کی بولی میں ایمان ہے: -

اِلَّا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا

تم جبھی کامیابی پا سکتے ہو جب تمہارے دلوں کے اندر، روح کے اندر، وہ چیز پیدا ہو جائے کہ جس کا نام قرآن مجید کی بولی کے اندر ایمان ہے۔

ایمان کے معنی ہیں عربی میں زوالِ شک کے۔ یعنی کامل درجہ کا بھروسہ اور کامل درجہ کا اقرار تمہارے دل میں پیدا ہو جائے۔ جب تک کامل درجہ کا یقین تمہارے دلوں کے اندر نہ پیدا ہو۔ اللہ کی صداقت پر، اللہ کی سچائی پر، اللہ کے اصولوں پر، جس وقت تک کامل درجہ کا یقین تمہارے قلب کے اندر پیدا نہ ہوگا، کامیابی کا کوئی دروازہ تمہارے لیے نہیں کھل سکتا۔ شک کا اگر ایک کانٹا بھی تمہارے دل میں چبھ رہا ہے تو تم کو اپنے اوپر موت کا فیصلہ صادر کرنا چاہیے۔ تم کو کامیابی نہیں ہو سکتی۔ سب سے پہلی شرط یہ ہے کہ تمہارے دل کے اندر ایمان، اطمینان، یقین، جماؤ، تمکن اور اقرار پیدا ہو لیکن کیا محض دل کا یہ کام دفاع کا، یہ فعل تصور کا، یہ نقشہ کامیابی کو پورا کر دے گا؟ نہیں!

فرمایا ایک دوسری بھی منزل اس کے بعد آتی ہے۔ جب تک وہ دوسری منزل بھی کامیابی کے ساتھ طے نہ کرلو گے اس ایک منزل کو طے کر کے کامیابی نہیں پا سکتے اس کا نام قرآن کی بولی میں عملِ صالح ہے:-

وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ

یعنی وہ کام جو اچھائی کے ساتھ کیا جائے، جس کام کو، جس صحت اور جس طریقہ کے ساتھ کرنا چاہیے جو طریقہ اس کے لیے سچا طریقہ ہو سکتا ہے اس کام کو اس کے ساتھ انجام دینا۔

قرآن کا یہ اصول تو عام ہے۔ ایمان کے معنی ہیں وہ یقین، وہ کامل اطمینان، وہ کامل اقرار کہ جو عمل سے پہلے پیدا ہوتا ہے۔ وہ چیز جو ان کے دماغ میں موجود تھی، وہ ارادہ جو ان کے دماغ میں پیدا ہوا تھا، وہ پہلی منزل ہوئی۔ جو مذہب میں آکر ایمان کا نام اختیار کر لیتی ہے۔ بالکل جیسے وہ عمل دماغ ہے، وہ عمل تصور و یقین ہے۔ اسی بنا پر سب سے پہلی منزل ایمان کی ہے۔ پہلی تجویز یہ ہے کہ تمہارے دل کے اندر سچا ارادہ پیدا ہو، سچا عزم پیدا ہو۔ دوسری منزل یہ ہے: وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ، صرف دماغ کی منزل طے کر کے قدم نہ ٹھہر جائیں، بلکہ عمل بھی کرو، اور وہ جو صالح ہوں۔ جو صحیح طریقہ ہے اس کام کے انجام دینے کا جب اس کو پورا کر لیا تو اس کے معنی یہ ہوئے کہ فتح مندی اور کامیابی کی دو منزلیں تم نے کامیابی کے ساتھ طے کر لیں۔ مگر پھر کیا تمہارا کام ختم ہو گیا؟ اس کے بعد کیا تم منزل مقصود تک پہنچ جاؤ گے؟ قرآن کی عالمگیر صداقت کہتی ہے کہ نہیں۔ کہ دو منزلوں کے بعد دو منزلیں اور بھی باقی ہیں۔ اپنی ہمت تو آزما لو کہ ان کے لیے تمہارے تلوے تیار ہیں یا نہیں؟ تمہاری کمر ہمت مضبوط ہے یا نہیں؟ اگر نہیں ہے تو ممکن ہے کہ یہ دو منزلیں تمہارے لیے سود مند نہ ہوں۔ وہ دو منزلیں یہ ہیں قرآن مجید نے فرمایا کہ ایمان اور عمل صالح ان کے اندر پیدا ہوں لیکن یہ نہ ہو کہ یہ جو انسانیت کی ایک زنجیر ہے اس کی ایک کڑی سے اپنے کو درست کر لیا۔ لیکن کیا ایک کڑی کے درست کر لینے کے بعد زنجیر کا پورا کام ہو گیا؟ ایک منٹ کے لیے بھی نہیں۔ تم کیا ہو؟ ایک تمام افراد کی شکل میں یعنی اس بکھری ہوئی شکل میں بیکار ہو، اس میں تمہارا کوئی وجود نہیں۔ قرآن وجود مانتا ہے اجتماع کا، اس کے نزدیک وجود کڑیوں کا نہیں ہے، بلکہ زنجیر کا ہے۔ تم میں سے ہر وجود ایک کڑی ہے اس کا کام پورا نہیں ہو سکتا جب تک وہ باقی کڑیوں کی خبر نہ لے۔ جب تک باقی کڑیاں مضبوط نہ ہوں گی، زنجیر مضبوط نہیں ہو سکتی۔ اس لیے فرمایا: کامیابی کا سفر کامیاب نہیں ہو سکتا جب تک تیسری منزل تمہارے سامنے نہ آئے۔ وہ تیسری منزل ان فصیح بلیغ معنوں میں ہے کہ

وَتَوَاصَوْا بِالْحَقِّ وَتَوَاصَوْا بِالصَّبْرِ

تیسری منزل ہے تواصِ حق کہ تم جو ایک کڑی تھے، تم نے اسے ایمان کی مضبوطی سے استوار کیا۔ لیکن تمہارا کام ختم نہیں ہوا۔ تمہارا فرض ہے کہ دوسری کڑیوں کی طرف توجہ کرو۔ اس کو یوں درست کر سکتے ہو کہ دنیا میں اللہ کی سچائی کا پیغام پہنچاؤ، اور جس سچائی کو تم نے پھیلایا ہے دوسروں کو بھی اس سے تجلی دینا، حق و سچائی کی وضاحت کرنا جب تک تم میں یہ بات نہ ہوگی کہ تمہارا دل سچائی کے اعلان کے لیے تڑپنے لگے، جب تک توصّی حق نہ کرو گے، کامیابی تم کو نہیں مل سکتی۔ لیکن اگر اس تیسری منزل کے لیے تم تیار ہو گئے، اگر توفیقِ الٰہی نے تمہاری دستگیری کی تو پھر آخری منزل کونسی ہے؟ وہ ہے جو منزل صبر کی منزل کے لیے لازم و ملزوم ہے۔ اس کے ساتھ اس کی گردن اس طرح جڑی ہوئی ہے کہ جدا نہیں کی جا سکتی۔ فرمایا کہ حق کی وہ وصیت کریں گے۔ چناں چہ وہ حق کا پیغام سنائیں گے۔ حق کی دعوت پہنچائیں گے۔ حق کا یہ حال ہے کہ حق کی راہ میں کوئی قدم نہیں اٹھ سکتا جب تک وہ قربانیوں کے لیے قدم نہ اٹھائیں۔ فرمایا کہ صرف حق ہی کا پیام وہ نہ پہنچائے، بلکہ صبر کا بھی پہنچائے۔ تم نے اپنی بدبختی سے نہ صرف شریعت کے

حکم کو بدلا ہے، بلکہ اپنے طریقِ عمل سے شریعت کے لفظوں کی بولیوں کو بھی بدل ڈالا۔ صبر کے معنی کیا ہیں؟ تم سمجھتے ہو کہ صبر کے معنی ہیں بے عزتی اور باطل کی پرستش اور پوجا۔ تم صبر کے معنی یہ سمجھتے ہو۔ قرآن کی اصطلاح میں صبر کے معنی کیا ہیں؟ ایک منٹ کے لیے بھی جو شخص صبر کے یہ معنی سمجھتا ہے، اس سے بڑھ کر قرآن مجید کی تحریف لفظی کرنے والا کوئی نہیں، تحریف معنوی تو بہت سے علماء کر رہے ہیں، لیکن تحریف لفظی یہ ہے کہ اگر صبر کے معنی یہ ہیں کہ تمہیں حق کے مقابلہ میں مصیبت آ جائے تو تم کو چاہیے کہ تم صبر کے گوشہ میں پناہ لو۔ یعنی ہر طرح کی بے عزتی کو، بے چارگی کو، باطل پرستی کو قبول کرلو۔ تو تم سے بڑھ کر قرآن کی تعلیم کا بدلنے والا کوئی نہیں۔ صبر کے معنی بالکل اس سے مختلف ہیں۔ صبر کے معنی ہیں برداشت کے۔ صبر کے معنی ہیں جھیلنے کے۔ صبر کے معنی ہیں تحمل کے۔ جو تم مقصد کی رہ میں اپنے محبوب و پیارے مقصد کے لیے اٹھاؤ اور اس میں طرح طرح کی مصیبتیں آئیں، طرح طرح کی ڈراؤنی صورتیں آئیں۔ زنجیر اور ہتھکڑیاں آئیں۔ بلکہ ممکن ہے کہ تمہارے سامنے تختہ آئے اور اس پر ایک پھندا لٹکے۔ یہ سب تمہارے سامنے آئے گا لیکن اگر تم حق کے پرستار ہو، تو تمہارا فرض ہونا چاہیے کہ تمہارے اندر صبر ہو، تمہارے اندر برداشت کی وہ اٹل طاقت ہو، وہ پہاڑ برداشت تمہارے اندر موجود ہو، کہ دنیا کی کوئی مشکل کوئی تاج وتخت اس پر فتح یاب نہ ہو سکے، یہ معنی صبر کے ہیں۔ چنانچہ قرآن مجید کے مواقع استعمال پر اگر غور کیا جائے تو معلوم ہو جائے گا کہ ہر جگہ صبر کے یہی معنی ہیں۔

مقصد یہ تھا کہ قرآن مجید نے جو صداقت کہ نوعِ انسان کے آگے کامیابی کے لیے پیش کی ہے۔ قرآن مجید نے اب سے تیرہ سو برس پیشتر جو ایک اٹل اور لازوال پروگرام بنا دیا ہے، یہ اس کی چار دفعات ہیں۔ اگر وہ کوئی سفر ہے تو یہ اس کی چار منزلیں ہیں۔ ہم کو ایک منٹ کے لیے غور کرنا چاہیے کہ جس بھیس میں حقیقتاً ہمارے سامنے آئی ہے اس چادر کے ساتھ یہ مخلوط ہے۔ کیا تم دنیا میں کوئی کامیابی بلا ایمان کے پا سکتے ہو؟ کیا تم شک کا روگ اپنے پہلو میں لے کر دنیا کی کوئی چھوٹی سے چھوٹی کامیابی پا سکتے ہو؟ کیا تم دنیا میں ایک مٹھی جو اور چاول بھی پا سکتے ہو؟ جب تک تمہارے اندر طلب کے لیے حق نہ ہو۔ کیا ایک لمحہ کے لیے دنیا کی کوئی کامیابی اپنا چہرہ تمہیں دکھا سکتی ہے جب تک تم حق کی راہ میں قربانی چڑھانی کو تیار نہ ہو؟

اللہ کی اس کائنات کے ایک ایک ذرہ کے اندر اس حقیقت کی عالمگیر تصدیق موجود ہے اور اس دنیا میں کامیابی کا کوئی چہرہ نہیں دیکھ سکتا، جب تک وہ ایمان، حق اور صبر کی منزل سے نہ گزرے۔ اللہ کا ہر قانون ہر اڑنے والے پرندے کے لیے ہے۔ کیا اللہ اپنا قانون تمہارے لیے بدل دے گا؟ کیا اللہ تمہاری غفلتوں کا ساتھ دے گا؟ اگر تم اپنی غفلت کی وجہ سے اس دھوکہ میں پڑے ہوئے ہو تو تم سے بڑھ کر اپنی موت کی طرف جانے والا کوئی نہیں ہے۔

میرے دوستو! آج ہمارا پہلا فرض یہ ہونا چاہیے کہ ہم اپنی گزشتہ کامیابیوں کے افسانے نہ دہرائیں، بلکہ ہر شخص اپنے عمل کا احتساب کرے، اور اپنے دل سے پوچھے کہ کیا واقعی اس کے دل کے اندر ایمان کا بجھا ہوا چراغ روشن ہو گیا؟ کیا واقعی اس کے اندر عملِ صالح پیدا ہو گیا؟ کیا واقعی اس کے اندر حق پیدا ہو گیا؟ اب اس پروگرام کی آخری منزل قربانی کی ہے، اگر اس کے لیے تیار ہو تو اللہ کی کامیابی تمہارے استقبال کے لیے تیار ہے۔ اگر ایمان ہمارے اندر پیدا نہیں ہوا ہے، اگر اب تک ہمارا دل شک سے خالی نہیں ہے، اگر ہمارے دل کے اندر حق کا یہ پہلا احساس نہیں پیدا ہوا ہے کہ جو کچھ ہم کر رہے ہیں اگر یہ سچ ہے تو ضرور ہے کہ کامیابی ہو، اور دنیا کی ساری طاقتوں کے مقابل میں اس کو فتح ہو۔ اگر اللہ کی چوکھٹ سے بھاگے ہوئے سر اس کے آگے پھر نہ جھکے ہوں تو پھر کون سی شب ہے جو تمہارے چوکھٹ پر آئے گی اور تمہاری کنڈی کھٹ کھٹائے گی۔ اگر اب بھی تم ایمان، توصّیِ حق، عمل صالح اور قربانی کے لیے نہیں ہو، تو تم کو حق نہیں ہے کہ تم اللہ کی زمین میں کامیابی کو ڈھونڈو۔

جب تک یہ چار چیزیں ہمارے اندر پیدا نہ ہوں گی، جو ہماری تمام کامیابیوں کے لیے علت تھیں۔ جن کو تمام کرۂ رضی میں دشمن پامال کرتے کرتے نہ کر سکے۔ جس طرح یہ شرائطِ اسلامی آپ کے لیے ضروری ہیں، اس کے متعلق جو منزلیں آپ کے سامنے آئیں تھیں جب تک اُس منزل کو آپ کامل ایمان، عمل صالح، کامل قربانی کے ساتھ انجام نہ دیں گے باقی منزلیں آپ کے سامنے نہیں آ سکتیں۔ جب کوئی مقصد کسی کے سامنے رکھا جاتا ہے تو وہ پوچھتا ہے کہ اس کا انجام کب ملے گا، وہ ادعاء فرض کے معاملہ کو دکان داری بتاتے ہیں۔ وہ پوچھتے ہیں نتیجہ کب نکلے گا؟ فرض اس امر کا محتاج نہیں ہے کہ نتیجہ کیا پیدا ہوگا۔ اگر فرض فرض تو ہمیں چاہیے کہ ہم پورا کریں۔ نتیجہ پر غور کرنا ہمارا کام نہیں ہے۔ دنیا میں بیج ہے، زمین ہے، انسان ہے اور اس دنیا میں اللہ بھی ہے۔ کیا تم اللہ کا کام اللہ کی زمین پر کر سکتے ہو؟ تم تو یہ کر سکتے ہو کہ تمہاری جھولی میں جو دانہ ہے، زمین کے سپرد کر دو پھر وہ اللہ ہے جو اپنی رحمت کو بھیجتا ہے اور اپنے بادل کو برساتا ہے۔ اور جو بیج تم نے زمین کے سپرد کر دیا تھا اس کو بار آور کرتا ہے۔ تمہارا فرض ہے کہ زمین صالح ہو، دانہ سچا ہو، اگر تمہارے ایمان کا دانہ سچا ہے اور اپنے دل کی جس سر زمین میں ڈالا ہے، وہ سر زمین شور [1] نہیں ہے تو ضرور ہے کہ وہ دانہ زمین کے پردے کو چاک کرے گا، اور اپنی کامیابی کا سر نکالے گا۔

(ماخوذ: خطبہ صدارت جلسہ آگرہ ۱۹۲۱ء)

❀ ❀ ❀ ❀ ❀

---

[1] شور: ریلی/کھاری زمین جس میں کچھ پیدا نہ ہو۔

مولانا محمد جمیل اختر جلیلی ندوی

جہاد میں رسول اللہ ﷺ کا اسوہ

اللہ تبارک و تعالیٰ نے حضور اکرم ﷺ کو ہمارے لیے بہترین مثال اورنمونہ (Ideal) قرار دیا ہے، ارشاد باری ہے:-

لَقَدْ كَانَ لَكُمْ فِيْ رَسُوْلِ اللّٰهِ اُسْوَةٌ حَسَنَةٌ

(الأحزاب:۲۱)

''اللہ کے رسول میں تمہارے لیے بہترین نمونہ ہے۔''

آنحضرت ﷺ کی یہ مثالیت کسی ایک امر کے ساتھ خاص نہیں؛ بلکہ شعبہ ہائے زندگی کے تمام امور کے ساتھ متعلق ہے اور اللہ کے رسول ﷺ نے امت کے سامنے بذات خود اس مثالیت کو اس انداز میں برت کر پیش کیا ہے، جس کی نظیر نہ تو تاریخ کے خزاں رسیدہ کسی ورق میں مل سکتی ہے اور نا ہی بہار دیدہ کسی صفحہ میں۔

عصبیت سے اجتناب

نبی کریم ﷺ نے اپنی زندگی میں جتنی بھی جنگیں لڑی ہیں، ان کا واحد مقصد اُس خالق کے کلمہ کو چہار دانگِ عالم میں بلند اور غالب کرنا تھا، جس نے ساری کائنات کو پیدا کیا، ان جنگوں میں نہ تو ذاتی مفاد کا دخل تھا اور نا ہی کسی عصبیت کا اثر۔

جب ہم تاریخ کے صفحات پلٹتے ہیں اور جنگوں کی تاریخ کا مطالعہ کرتے ہیں تو ہمیں صاف طور پر نظر آتا ہے کہ لڑائیاں مفاد پرستی اور عصبیت کی شکار رہی ہیں، کہیں قومی عصبیت کی جنگ ہے تو کہیں لسانی تنگ نظری کی لڑائی، کہیں معدنی تیل کے لیے معرکہ ہے تو کہیں زمیں داری کے لیے ہنگامہ، کہیں بادشاہت کا مفاد کارفرما ہے تو کہیں صدارت کی غرض درپیش، کہیں ٹکنالوجی کی ترقی کا حسد ہے تو کہیں معاشی استحکام کی جلن، غرض کسی نہ کسی مفاد اور عصبیت کے تحت جنگیں لڑی گئی ہیں موجودہ زمانہ میں ہم کھل کر اس کا مشاہدہ کر رہے ہیں۔

انسانیت کا احترام

سن دو ہجری میں کفار قریش اور مسلمانوں کے درمیان جنگ ہوئی، جو''جنگِ بدر'' کے نام سے تاریخ کے صفحات میں مذکور ہے، اس جنگ میں ستر مشرکین کام آئے، جب یہ جنگ ختم ہوگئی تو آپ ﷺ نے ان مقتولین کو کنویں میں ڈلوا دیا اور اوپر سے مٹی پاٹ دی گئی، یہ محض انسانیت کے احترام میں تھا --- کیا آج کی جنگوں میں انسانیت کے اس احترام کو ملحوظ رکھا جاتا ہے؟ جنگوں میں تو قصداً نعشوں کو بے گور وکفن چٹیل میدان میں چھوڑ دیا جاتا ہے؛ تاکہ انسانیت کا جو تھوڑا احترام باقی رہ گیا ہے، اسے جانور مل کر ختم کر دیں، چیر پھاڑ کرنے والے پرندے اور درندے اسے گھسیٹتے پھریں، کاش! حضور ﷺ کے اس عمل کو سامنے رکھ کر میدانِ جنگ میں بھی انسانیت کا احترام کرنا سیکھتے!!!

عورتوں کو ہلاک کرنے کی ممانعت

اسلام ایک ایسا دین ہے، جس نے عورتوں کے حقوق کی حفاظت کی ہے۔ جن سے مرد محروم ہیں، انھیں میں سے ایک ''جنگ میں ان کو قتل کرنے'' کی ممانعت بھی ہے؛ چنانچہ بخاری کی روایت میں ہے کہ آں حضرت ﷺ نے کسی جنگ میں ایک خاتون کو مقتول پایا تو سختی کے ساتھ جنگ میں کسی خاتون کو قتل کرنے سے منع فرما دیا (بخاری، باب قتل النساء فی الحرب، حدیث نمبر: ۳۰۱۵)۔ کیا آج کی جنگوں میں اس بات کا خیال رکھا جاتا ہے کہ عورتیں ہلاک نہ کی جائیں ؟ آج تو اصل محارب کا سارا غصہ انھیں پر اتارا جاتا ہے اور جو محارب ہوتے ہیں، وہ نشانہ بننے سے کوسوں دور رہتے ہیں، اور یہ صرف آج کی جنگوں کا ہی حال نہیں ہے؛ بلکہ ماضی کی جنگوں میں بھی ایسے ''کارنامے'' عورتوں کے ساتھ انجام دیے گئے ہیں، جن کو سن کر آج بھی ہر ذی شعور شخص کا جسم سن اور رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں، کاش ! آں حضرت ﷺ کے طرزِ عمل کو ان جنگوں میں اپنایا جاتا!!!

بچوں کو قتل نہ کرنے کا حکم

بچے ایسے پھول کی مانند ہوتے ہیں، جسے ہر شخص محبت کی نظر سے دیکھتا ہے، آں حضرت ﷺ کو بھی بچوں سے بے انتہا محبت تھی، آپ ﷺ کبھی ان کے ساتھ ڈانٹ ڈپٹ کا معاملہ بھی نہیں فرماتے تھے، اگر وہ کوئی غلطی کرتے تو انھیں پیار سے سمجھاتے، غزوۂ بدر کے بعد حضرت خبیب رضی اللہ عنہ مسلمانوں کی ایک جماعت کے ساتھ مشرکینِ مکہ کی خبر دریافت کرنے گئے۔ اتفاق سے گرفتار کر لیے گئے، گرفتاری کے بعد بنو حارث نے اپنے باپ کے بدلہ میں (جس کو حضرت خبیب رضی اللہ عنہ نے غزوۂ بدر میں قتل کیا تھا) قتل کرنے کے لیے خرید کر قید کر دیا، حضرت خبیب رضی اللہ عنہ کو یہ یقین ہو چکا تھا کہ ضرور قتل کیے جائیں گے؛ چنانچہ انھوں نے اپنے رب سے ملاقات

کے لیے تیاری کی اور تنظیف وتطہیر کے لیے ایک استرا ادھار لیا، اسی دوران بنو حارث کی کسی خاتون کا چھوٹا بچہ کھیلتے کھیلتے ان کے پاس پہنچ گیا، انھوں نے پیار سے اس بچہ کو اپنی گود میں بٹھا لیا، ماں نے جب اپنے بچے کو ایسے دشمن کی گود میں دیکھا، جسے کل قتل کیا جانا تھا اور وہ اس حال میں کہ ہاتھ میں استرا تھا تو وہ حواس باختہ ہوگئی، حضرت خبیب رضی اللہ عنہ نے ماں کی اس گھبراہٹ کو پہچان لیا اور کہا: تم ڈر رہی ہو کہ میں اسے قتل کر دوں گا، میں اسے قتل نہیں کروں گا اور بچے کو ماں کے سپرد کر دیا (قصص من التاریخ الاسلامی، ص:۵۷)، بچوں کے ساتھ اس محبت کو اللہ کے رسول ﷺ نے میدانِ جنگ میں بھی باقی رکھا اور حکم جاری کیا کہ "کسی بچہ کو قتل نہ کیا جائے۔" (بخاری، کتاب الجہاد، باب قتل الصبیان فی الحرب، حدیث نمبر: ۳۰۱۴، مسلم، حدیث نمبر: ۴۵۴۷)، اس حکم کو آپ ﷺ اور آپ کے صحابہ نے برت کر بھی دکھایا؛ چنانچہ جہاد کی تاریخ میں بچے کو قتل کرنے کی روایت ہمیں نہیں ملتی۔ کیا آج بڑوں سے کہیں زیادہ بچوں کو موت کے گھاٹ نہیں اتارا جاتا ہے؟ ان سے کس جرم کا بدلہ لیا جاتا ہے؟ وہ تو دشمنی کے نام سے بھی واقف نہیں، کاش! آں حضرت ﷺ کی سیرت کا مطالعہ کیا جاتا اور جنگ میں بچوں کے زیادتی نہ کرنے کے حکم پر عمل کیا جاتا!

مُثلہ نہ کرنے کا امر

جنگوں میں غصہ کے اظہار کا آخری طریقہ "مثلہ" ہے، جس میں مقتول کی بے حرمتی کے لیے اس کے اعضاء و جوارح کاٹ دیے جاتے ہیں، زمانہ جاہلیت میں اس کا رواج تھا، موجودہ زمانہ میں بھی دیکھنے کو ملتا ہے، بس فرق طریقۂ کار کا ہوتا ہے، پہلے اعضاء ایک ایک کر کے کاٹے جاتے تھے اور آج بم برسا کر ایک ہی لمحہ میں چیتھڑے اڑا دیے جاتے ہیں۔ حضور اکرم ﷺ نے جتنی بھی جنگیں لڑیں، ان میں کہیں بھی مقتولین کے ساتھ بے حرمتی کا جرم نہیں کیا گیا؛ آپ کے محبوب چچا حضرت حمزہ رضی اللہ عنہ کی شہادت کے بعد ان کا مثلہ کیا گیا، اگر آپ چاہتے تو اس کا بدلہ بعد کی جنگوں میں لے لیتے؛ لیکن آں حضرت ﷺ نے غم کا کڑوا گھونٹ تو پینا پسند فرمایا، انتقاماً بھی ایسی حرکت کو گوارا نہیں فرمایا؛ بلکہ صراحتاً اس کی ممانعت فرمائی؛ چنانچہ حضرت عمران بن حصین رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ: "حضور اکرم ﷺ جب بھی ہمارے درمیان خطیب کی حیثیت سے کھڑے ہوئے تو صدقہ کا حکم دیا اور مثلہ کرنے سے منع فرمایا"۔ (مسند احمد، حدیث نمبر: ۲۰۰۹۷)، کاش! جنگ کی آگ بھڑکانے والے آپ ﷺ کے اس طرز عمل کو اختیار فرماتے!

مذہبی پیشواؤں کو نہ مارنے کا حکم

فاتح قوم دورانِ جنگ طیش وطنطنہ میں سب کچھ بھول جاتی ہے، اس کے سامنے مخالفین میں سے ہر شخص کی حیثیت ایک لڑائی کرنے والے کی ہوتی ہے، خواہ معابد کے ربی ہوں یا صوامع کے راہب، مندر کے پجاری ہوں یا مسجد کے امام، بکریوں کے ریوڑ کی طرح ایک ہی ڈنڈے سے سب کو ہانک دیتے ہیں؛ حالاں کہ عموماً یہ لوگ معتدل مزاج اور جنگ و جدال سے دور رہنے والے ہوتے ہیں۔ نبی اکرم ﷺ کی جنگوں میں ان چیزوں کی رعایت ہوتی تھی، ایک ہی ڈنڈے سے سب کو نہیں ہانکا جاتا تھا؛ چنانچہ حضرت عبد اللہ ابن عباس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ جب اپنے لشکر کو بھیجتے تو حکم دیتے ہوئے فرماتے تھے: "......نہ تو مثلہ کرو، نہ بچوں کو قتل کرو اور نا ہی صوامع والوں (مذہبی پیشواؤں) کو قتل کرو۔" (مسند احمد، حدیث نمبر: ۲۷۲۸) ---- کاش! جنگوں میں آپ ﷺ کے اس اسوہ کو اپنایا جاتا!

دشمنوں کے ساتھ حسن سلوک

غزوۂ بدر کے موقع پر حضرت حباب رضی اللہ عنہ کے مشورے پر عمل کرتے ہوئے آں حضرت ﷺ نے بدر کے چشمہ پر قبضہ کر لیا تھا، اگر چاہتے تو کسی کافر کو، جو خود انھیں کے ساتھ مقابلہ آرائی کے لیے بھی آیا ہوا ہو، ایک گھونٹ پانی بھی نہ دیتے؛ لیکن قربان جائیے رسول اللہ ﷺ پر! کہ کافروں کو پانی لینے کی عام اجازت دیدی۔ کیا ہم بھی اپنے دشمنوں کے ساتھ ایسا ہی رویہ اپناتے ہیں؟ کیا ہم اپنے دشمن کے بارے میں ہر وقت ایذا رسانی کے لیے نہیں سوچتے رہتے؟ حضور اکرم ﷺ کے عمل سے ہمیں یہ سبق ملتا ہے کہ ہم اپنے دشمنوں کے ساتھ بھی حسن سلوک کریں اور بالخصوص زندگی سے متعلق ایسی عام چیزوں سے قطعاً نہ روکیں، جو ایک انسان کے لیے نہایت ضروری ہو۔

دشمن محسن کے ساتھ حسنِ سلوک

غزوۂ بدر میں گھمسان کا رن پڑنے سے پیشتر آں حضرت ﷺ نے یہ فرمایا تھا کہ بنو ہاشم اور دیگر قبائل کے کچھ لوگ بادلِ نخواستہ اِس جنگ میں شریک ہوئے ہیں، لہٰذا اُنھیں قتل نہ کیا جائے، ابوالبختری بن ہشام اور عباس بن عبد المطلب کو قتل نہ کیا جائے، بنو ہاشم نہ صرف یہ کہ طوعاً و کرہاً جنگ میں آئے تھے؛ بلکہ شعب ابی طالب میں بھی آپ ﷺ کے لیے تکلیفیں برداشت کی تھیں، ابو البختری نے کئی مرتبہ شعب ابی طالب میں کھانا پہنچایا تھا، نیز مقاطعہ کے ختم کرنے میں بھی اس کا اہم رول تھا، یہ سارے آپ ﷺ اور مسلمانوں کے محسنین تھے، لہٰذا آں حضرت ﷺ نے ان کے احسان کا اس طرح بدلہ چکایا۔

اب ہمیں سوچنا ہے کہ اپنے محسن کا کتنا خیال رکھتے ہیں؟ کیا ایسا نہیں ہوتا کہ اپنے ذاتی مفاد کی خاطر ہم اپنے محسن کی ٹانگ نہیں کھینچتے؟ ہم میں سے تو بہت سارے ایسے بھی ہیں، جو اپنے محسن ہی کے دشمن بن جاتے ہیں اور جنگ کے موقع پر تو محسن اور دوست سب دشمن ہی کے صف میں ہوتے ہیں، جب کہ دشمنی میں ہم کسی تفریق کے قائل نہیں، کاش! حضور ﷺ کے اس طرز کا ہم بھی کچھ پاس ولحاظ کر لیتے!!!

قیدیوں کے ساتھ حسنِ سلوک

غزوۂ بدر سے فارغ ہو کر آپ ﷺ مدینہ پہنچے اور قیدیوں کو صحابہ رضی اللہ عنہم کے درمیان یہ حکم دیتے ہوئے تقسیم فرمایا: "استوصوا بالأسارى خيراً" "قیدیوں کے ساتھ بھلائی کا سلوک کرو"، جس کا نتیجہ تھا کہ صحابہ رضی اللہ عنہم ان کی رسیوں کو ہلکی گرہ لگاتے؛ تا کہ تکلیف نہ ہو، نیز خود تو موٹا جھوٹا کھاتے؛ لیکن قیدیوں کو حسبِ استطاعت عمدہ کھلانے کی کوشش کرتے اور ان کا ہر طرح سے خیال رکھتے؛ چنانچہ حضرت مصعب بن عمیر رضی اللہ عنہ کے ماں شریک بھائی ابو عزیز کہتے ہیں: "میں بدر کے قیدیوں میں انصار کے حصہ میں تھا، وہ لوگ آپ ﷺ کے اس حکم کی وجہ سے صبح و شام مجھے روٹی کھلاتے، جب کہ خود کھجور کھاتے تھے۔" (المعجم الکبیر للطبرانی، حدیث نمبر: ۹۷۷)۔

اس کے بر خلاف آج قیدیوں کے ساتھ جانوروں سے بھی بدتر سلوک کیا جاتا ہے، ان پر کتے چھوڑے جاتے ہیں، بجلی کا شاٹ دیا جاتا ہے، ناخن کھینچ لیے جاتے ہیں، پتھر کی سلوں پر مسلسل لٹایا جاتا ہے، تیز روشنی کر دی جاتی ہے؛ تا کہ قیدی پلک بھی نہ جھپکا سکے، مسلسل کھڑے رہنے پر مجبور کیا جاتا ہے، کھانے پینے کے لیے ترسایا جاتا ہے، سخت سردی کے موسم میں ٹھنڈے پانی میں کمر تک ڈوبے رہنے پر مجبور کیا جاتا ہے، کاش! یہ لوگ آخری نبی ﷺ کے قیدیوں کے ساتھ سلوک کا مطالعہ کرتے اور ایک انسان کے احترام کو ملحوظ رکھتے ہوئے آں حضرت ﷺ اور صحابہ رضی اللہ عنہم کے عملی نمونہ کو اپناتے، کاش ...... کاش ...... !!!

دورانِ جنگ دشمن کے حق میں دعا

غزوۂ احد میں عبد اللہ بن قمئہ کے حملہ کی وجہ سے آں حضرت ﷺ زخمی ہو گئے اور آپ ﷺ کے سامنے کے دو دانت بھی ٹوٹ گئے، ایسے وقت میں بھی آپ دعا دیتے ہوئے فرماتے ہیں: "اے اللہ! میری قوم کو بخش دے، وہ نہیں جانتی۔" (مسلم، باب غزوۃ أحد، حدیث نمبر: ۱۷۹۲)، اسی طرح محاصرۂ طائف کے دوران بعض نے محصورین کے حق میں بد دعا کی درخواست کی، جس کے جواب میں آپ ﷺ نے یہ دعا دی: "اللّٰهم اهد ثقيفا، وائت بهم" "اے اللہ! ثقیف کو ہدایت دے اور میرے پاس آنے کی توفیق دے۔" (مصنف ابن ابی شیبہ، ما جاء فی ثقیف، حدیث نمبر: ۳۳۱۶۳)۔ کیا ہمارا رویہ بھی ایسا ہی ہوتا ہے؟ کیا ہم معمولی بات پر بد دعا دینا نہیں شروع کر دیتے؟ کیا ہم بھی اپنے دشمن کے لیے ہدایت کی دعا کرتے ہیں؟ غزوۂ احد و حنین ہمیں یہ درس دیتے ہیں کہ دشمن کے حق میں بد دعا کے راستہ کو اپنانے کے بجائے اُن کے لیے ہدایت کی دعا کرنی چاہیے۔

سخت جاں دشمن کے ساتھ عفو و درگزر

اہل مکہ وہ لوگ ہیں، جنھوں نے اہل اسلام کو تکلیف دینے میں کسی طرح کی کوئی کسر باقی نہیں رکھی تھی، صحابہ رضی اللہ عنہم کے جسموں سے اُن زخموں کے داغ مٹے نہیں تھے، جو اہل مکہ نے ان پر لگائے تھے؛ بلکہ بعض صحابہ رضی اللہ عنہم کے زخم تو رِس ہی رہے تھے، اہل مکہ وہ لوگ تھے، جنھوں نے آپ ﷺ کے قتل کی سازش رچی تھی، جنھوں نے صحابہ رضی اللہ عنہم کے گھر بار اور دولت و جائداد پر غاصبانہ قبضہ کر رکھا تھا، جنھوں نے اُن کو دیارِ غیر جانے پر مجبور کر دیا تھا، سن آٹھ ہجری میں اُنھیں لوگوں پر فتح حاصل ہو رہی تھی، ان کے دلوں میں بھی کیا کیا اُمنگیں بدلہ لینے کی نہیں اُٹھی ہوں گی؟ انتقام لینے کی کیا کیا تدبیریں ان کے حاشیۂ خیال میں گردش نہیں کر رہی ہوں گی؟ لیکن صلح و عفو کی ایسی مثال قائم کی گئی، جس کی نظیر قدیم و جدید تاریخ کے اوراق میں ملنی مشکل ہے۔ آج معمولی دشمن پر بھی ہمیں اگر غلبہ مل جاتا ہے تو ہم اُس پر اس طرح پلٹ پڑتے ہیں، جس طرح شیرِ نر اپنے شکار پر پِل پڑتا ہے، معافی کا نام سنتے ہی ہمیں شاک لگ جاتا ہے، ہم تو بدلہ لینے کا بہانہ تلاشتے رہتے ہیں اور اس کے لیے رائی کو پربت بنانے سے بھی نہیں چوکتے۔ کاش! فتح مکہ ہماری نگاہوں کے سامنے رہے اور ہم اس کو اپنے لیے اسوہ بنا سکیں!!!

آگ میں جلا کر مارنے کی ممانعت

دورانِ جنگ ہر فریق کا مقصد اپنے مخالف کو ختم کرنا ہوتا ہے، خواہ اس کے لیے کوئی سا بھی طریقہ اختیار کرنا پڑے؛ چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ دور حاضر میں اس کے لیے مختلف قسم کے کیمیائی ہتھیار استعمال کیے جاتے ہیں، ایسے ہتھیار، جس سے انسان کا سارا بدن جل کر خاک ہو جاتا ہے؛ بلکہ آج کل زیادہ تر استعمال ہونے والے ہتھیار کا تعلق اسی قبیل سے ہے۔ حضور اکرم ﷺ نے اپنے کسی جنگ میں اس طرح سے اپنے مخالفین کو نہیں مارا ہے؛ بلکہ آں حضرت ﷺ نے صراحۃً اس طرح مارنے کو منع فرمایا ہے، حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، وہ فرماتے ہیں کہ اللہ کے رسول ﷺ نے ایک سریہ (وہ جنگ، جس میں حضور ﷺ خود شریک نہ ہوئے ہوں) میں بھیجتے وقت فرمایا: "اگر فلاں فلاں کو قابو میں کر لو تو ان دونوں کو جلا دینا۔" دوسرے دن ایک قاصد کے ذریعہ سے پیغام بھیجا کہ "میں نے ان دونوں آدمیوں کو جلانے کا حکم دیا تھا؛ لیکن اللہ تعالیٰ کے طریقے پر عذاب دینا درست نہیں؛ اس لیے اگر ان دونوں پر قابو پالو تو انھیں قتل کرنا۔" (مصنف ابن ابی شیبہ، من نھی عن التحریق بالنار، حدیث نمبر: ۳۳۸۱۴)، آپ ﷺ کا اسوہ ہمیں یہ سبق دیتا ہے کہ ہم غیظ و غضب میں اس قدر آگے نہ بڑھ جائیں کہ لوگوں کو جلا کر مارنا شروع کر دیں۔

انتقامی جنگ سے دوری

حضرت سعد بن عبادہ رضی اللہ عنہ نے فتح مکہ کے موقع سے وفورِ جذبات میں سرشار اور جوشِ جنوں میں بے خود ہو کر یہ کہہ دیا: "اليوم يوم الملحمة، اليوم تستحل الكعبة" "آج لڑائی کا دن ہے، آج کعبہ

میں جنگ و جدل جائز ہوگا۔'' حضرت ابو سفیان نے آپ ﷺ سے حضرت سعد رضی اللہ عنہ کی شکایت کی تو آپ ﷺ نے فرمایا: "كذب سعد، ولكن هذا اليوم يعظم الله فيه الكعبة، ويوم تكسى فيه الكعبة۔" (بخاری، باب أين ركز النبی ﷺ الراية يوم الفتح، حدیث نمبر: ۴۰۳۰) ''سعد نے غلط کہا، آج خانۂ کعبہ کی عظمت کا دن ہے، آج اس کو غلاف پہنایا جائے گا۔'' چوں کہ حضرت سعد رضی اللہ عنہ کی اس بات سے انتقام کی بو آ رہی تھی؛ اس لیے ان سے علم لے کر ان کے بیٹے قیس کو دے دیا۔ کیا آج کی جنگیں بھی انتقامی کارروائیوں سے خالی ہوتی ہیں؟ آج تو جنگ لڑی ہی انتقاماً جاتی ہے، اگر یہ انتقامی آگ کے لپٹ نہ اٹھے تو سرے سے کوئی جنگ ہی وجود میں نہ آئے، کاش! آج آنحضرت ﷺ کے اس اسوہ پر عمل کیا جاتا!!!

دورانِ جنگ عہد کا لحاظ

غزوۂ بدر میں مسلمانوں کی تعداد دشمنوں کے مقابلہ میں نہایت ہی کم تھی اور ایک آدمی کا اضافہ بھی باعث تسکین ہوتا، ایسے موقع پر حضرت حذیفہ رضی اللہ عنہ اور حضرت ابو حسیل رضی اللہ عنہ کو کہیں سے آتے ہوئے کفار راہ میں روکتے ہیں کہ محمد (ﷺ) کی مدد کو جا رہے ہیں، یہ انکار کرتے ہیں اور عدم تعاون کا وعدہ کرتے ہیں، کفار انھیں جانے کی اجازت دیدیتے ہیں، یہ دونوں حضور ﷺ کی خدمت میں حاضر ہو کر پوری بات بتاتے ہیں تو آپ ﷺ ان سے ہر حال میں وعدہ وفا کرنے کو کہتے ہیں اور جنگ میں شریک ہونے کی اجازت مرحمت نہیں فرماتے۔ ہم اپنا تجزیہ کریں کہ کیا ہم بھی وعدہ کا اس قدر پاس رکھتے ہیں کہ سخت ضرورت کے وقت بھی اس سے نہ پھریں؟ ہمارا حال تو بہت برا ہے، وعدہ پر وعدہ کرتے ہیں؛ لیکن وعدہ خلافی بھی ہمارا شیوہ ہے، ہم تو معمولی معمولی باتوں پر وعدہ کو توڑ بیٹھتے ہیں اور جنگ کو تو ''دھوکہ کا مجموعہ'' ہی سمجھتے ہیں، پھر وہاں دھوکہ سے باز کیسے آئیں؟ کاش! حضور ﷺ کے اس عمل سے ہم بھی ہر حال میں وعدہ کو وفا کرنا سیکھتے!!!

قیدیوں کی سزاؤں میں تخفیف

غزوۂ بدر کے اختتام کے بعد قیدیوں کو مدینہ لایا گیا اور رسیوں سے باندھ کر مسجد نبوی میں رکھا گیا، رات کو بعض قیدیوں کی کراہ سنائی دی، قیدیوں کی کراہ سن کر آں حضرت ﷺ بے چین ہو گئے اور بقیہ رات آنکھوں میں کاٹی، جب صبح ہوئی تو آپ ﷺ نے ان کی بندشوں کو ڈھیلا کرنے کا حکم دیا۔ کیا آج بھی قیدیوں کی سزاؤں میں تخفیف کی جاتی ہے؟ کیا آج بھی کوئی قائد قیدیوں کی تکلیف سے بے چین ہوتا ہے؟ آج کا قائد تو قیدیوں کو تنگ و تاریک سل میں بند کر کے چین کی بانسری بجاتے ہوئے محو خواب ہو جاتا ہے اور ان کی سزاؤں میں تخفیف کی بجائے اضافہ کی ہی سوچتا ہے، کاش! آپ ﷺ کے قیدیوں کے ساتھ اِس عمل سے سبق لیا جاتا!!!

قیدیوں کی رہائی

قیدی اس لیے نہیں ہوتے کہ ان کے بال بچوں کو جیتے جی یتیم کر کے موت تک ان کو بند کر کے رکھا جائے؛ بلکہ قید اس لیے کیا جاتا ہے؛ تاکہ ان کی مناسب فہمائش ہو جائے، پھر ان سے وعدہ وعید یا بطور تنبیہ کے کچھ تاوان وصول کر کے چھوڑ دیا جائے، آں حضرت ﷺ نے غزوۂ بدر میں ان جنگی قیدیوں کے ساتھ ایسا ہی معاملہ فرمایا، جنھوں نے آپ ﷺ اور آپ کے ساتھیوں کو بے سروسامانی کی حالت میں وطن چھوڑنے پر مجبور کر دیا تھا، آپ ﷺ نے کچھ قیدیوں سے فدیہ لے کر اور جو فدیہ دینے کے قابل نہیں تھے، انھیں بغیر فدیہ کے رہا فرما دیا۔ آج جنگی قیدیوں کو سب سے بڑا مجرم سمجھا جاتا ہے اور کوئی بھی حکومت انھیں آزاد کرنے کے لیے تیار نہیں ہوتی؛ بلکہ جس قدر تنگ و تاریک کمرہ میسر ہو سکے، اس میں قید کرنے کی کوشش کی جاتی ہے، کیا دنیا کی کوئی حکومت آپ ﷺ کے اس طرز عمل کا نمونہ پیش کر سکی ہے؟ قیدی بھی انسان ہوتے ہیں اور انسانیت کے احترام کے مستحق بھی ہوتے ہیں، کاش! حضور اکرم ﷺ کے اس اسوہ پر عمل کیا جاتا!

(بشکریہ: ''زندگی نو'' (دہلی): اگست ۲۰۱۸ء)

بقیہ: سرزمین شام

"پھر یاجوج اور ماجوج چل پڑیں گے اور خمر نامی پہاڑ کے پاس جا پہنچیں گے اور یہ پہاڑ بیت المقدس والا پہاڑ ہے (جب وہاں پہنچیں گے) تو کہیں گے جو لوگ زمین پر تھے انھیں تو ہم قتل کر چکے، چلو اب جو آسمان پر ہے اُسے قتل کریں، یہ کہتے ہوئے وہ اپنے تیر آسمان کی طرف پھینکیں گے تو اللہ ان کے تیروں کو خون کی طرح سُرخ کر کے اُن کی طرف پلٹا دے گا۔"

خلاصہ کلام

معزز قارئینِ محترم! بلادِ شام کی فضیلت اور اہمیت پر اہلِ ایمان کو بار بار ترغیب دی گئی ہے کہ وہ اس مقدس سرزمین کی طرف ہجرت کریں۔ قیامت تک شام کو اللہ کی نصرت اور مسلمانوں کی علمی و سیاسی قیادت کا مرکز قرار دیا گیا ہے۔ اس سرزمین میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا نزول اور امام مہدی کا ظہور بھی متوقع ہے۔ یہ تعلیمات اُمتِ مسلمہ کے عروج کے دوران شام کے اہم کردار کو واضح کرتی ہیں، جو اس کی تقدیر اور مستقبل کے حوالے سے فیصلہ کن ثابت ہوگی۔ اللہ تعالیٰ شام کے مسلمانوں کی مدد فرمائے۔

ڈاکٹر حبیب احمد خان

خدا اور مذہب
اور ملحدوں کے علمی و فکری مغالطے

مادیت پرست مغرب کو خدا اور مذہب سے سب سے بڑا مسئلہ یہ ہے کہ ہمیں خدا کی کیا ضرورت؟

مغرب کے پراڈائم شفٹ میں جب وہ زندگی کے ہر ہر دائرے اور ہر ہر شعبے کو مادی فائدے کے پیمانے پر ماپنے کھڑے ہوئے تو ان کی نگاہ محدود سے محدود تر ہوتی چلی گئی اور جب انھوں نے حقائق کو جاننے کا واحد پیمانہ اپنی محدود تر عقل کی تجربہ گاہ کو سمجھ لیا تو وہ سیدھی راہ سے بھٹکتے چلے گئے اسی گروہ کی بابت قرآن کریم میں آتا ہے:-

اَفَرَاَیْتَ مَنِ اتَّخَذَ اِلٰهَهٗ هَوٰىهُ وَاَضَلَّهُ اللّٰهُ عَلٰى عِلْمٍ وَّخَتَمَ عَلٰى سَمْعِهٖ وَقَلْبِهٖ وَجَعَلَ عَلٰى بَصَرِهٖ غِشٰوَةً ؕ فَمَنْ یَّهْدِیْهِ مِنْۢ بَعْدِ اللّٰهِ ؕ اَفَلَا تَذَكَّرُوْنَ (الجاثیۃ: ۲۳)

ترجمہ: دیکھو تو وہ جس نے اپنی خواہش کو اپنا خدا ٹھہرایا اور اللہ نے اُسے باوصف علم کے گمراہ کیا اور اس کے کان اور دل پر مہر لگا دی اور اس کی آنکھوں پر پردہ ڈالا تو اللہ کے بعد اُسے کون راہ دکھائے تو کیا تم دھیان نہیں کرتے۔

یہی وہ گروہ ہے کہ جو اپنی جہالت کے سبب گمراہ نہ ہوا بلکہ اس کی علمیت نے اسے گمراہی کے راستے پر ڈال دیا۔

یہ مادی تصور حیات مختلف زاویوں سے انسان کو اپنی گرفت میں لیتا ہے کہیں پر کوئی ڈارون اسے ارتقاء کی راہ سجھاتا ہے اور یہ سبق پڑھاتا ہے کہ صرف مضبوط تر لوگوں کو جینے کا حق ہے تو کہیں پر کوئی مالتھس انھیں سمجھاتا ہے کہ جب تک اس انسانی دنیا کا ایک بڑا حصہ کم نہ کر دیا جائے اور موجود لوگوں کی تعداد وسائل کے مقابلے میں محدود نہ ہو جائے بقاء ممکن نہیں کہیں پر کوئی فرائیڈ تمام تر انسانی جذبات و کیفیات کو نفسیاتی عوارض اور کمزوریوں سے جوڑ دیتا ہے کہیں پر ہابز کھڑا ہوتا ہے اور ایک بڑے عفریت لیوائیتھون کی جانب متوجہ کرتا ہے اور یہ سمجھاتا ہے کہ ایک فطری ریاست اسی وقت کھڑی ہو سکتی ہے کہ جب تک بڑے پیمانے پر قتل وخون نہ ہو جائے کہیں پر کوئی رسل تمام مابعد الطبیعیاتی امور کو واہمہ قرار دے کر ظاہر پرستی کی راہ ہموار کرتا ہے تو کہیں پر کوئی نطشے خدا کی موت کا اعلان کر دیتا ہے ایسے میں جان سٹیورٹ مل اور جیریمی بینتھم یہ تصور پیش کرتے ہیں کہ جس چیز کا کوئی مادی فائدہ نہ ہو اس کی کوئی اہمیت نہیں ہے۔

انسانیت اور انسان کی تباہی کے فیصلے مشینیت زدہ اور مادیت پرست یورپ نے جس انداز میں کیے ہیں اور جو کچھ اقدار اور اخلاقی و اصولی پیمانے ان کی جانب سے سامنے آئے ہیں وہ اتنے رکیک اور پست سطح کے ہیں کہ مادیت زدہ انسانوں کی عقل پر ماتم کرنے کو جی کرتا ہے۔

جب ہم سے یہ سوال پوچھا جاتا ہے کہ مذہب اور خدا کی ضرورت کیوں تو ہمارے بہت سے مفکرین از خود دفاعی پوزیشن پر چلے جاتے ہیں اور شیشے کے گھر میں بیٹھ کر مذہب کا مقدمہ لڑنے کی کوشش کرتے ان کے اندر اتنی جرات اور اعتماد ہی نہیں ہوتا کہ وہ اگلوں سے یہ پوچھ سکیں کہ میاں تم خود ہوائی قلعوں میں بیٹھ کر ہم سے سوال کرتے ہو، ہمارے ان مفاہمت پسند مفکرین کو کبھی یہ بات سوجھتی ہی نہیں کہ وہ سوال جو ایک مادیت پرست ملحد ہم سے پوچھ رہا ہے کم از کم اس سے اس کی اقدار کی بابت استفسار تو کیا جائے کم از کم اسے کٹہرے میں تو لایا جائے گویا کہ انھوں نے پہلے ہی ان اقدار کی برتری کو تسلیم کر لیا۔

الحاد کے اخلاقی پیمانے

ویسے تو الحادی اقدار کوئی متفق علیہ معاملہ نہیں ہیں یہ تبدیل ہوتی رہتی ہیں اور مخمصہ در مخمصہ کا شکار ہیں جدیدیت سے مابعد جدیدیت تک اور یوٹیلیٹیرین سے ایگیلی ٹیرین ازم تک ان کا ہر ہر فلسفہ آپس میں متصادم ہے لیکن اگر ان کی کوئی بنیاد تلاش بھی کر لی جائے تو وہ اتنی کمزور ہے کہ اس پر کوئی عمارت کھڑی کرنا ممکن ہی نہیں۔

مثال کے طور پر ایک مادیت پرست ذہن ایک

تمثیل پیش کرتا ہے، فرض کیجیے کہ یہ دنیا ایک مکان ہے اور اس دنیا میں موجود چیزیں ہماری ضرورت پوری کرتی ہیں اس مکان میں موجود چیزوں کی ضرورت و اہمیت کا تعین کیسے کیا جائے یہ ایک صوفہ ہے جس پر ہم بیٹھتے ہیں، یہ گھڑی ہے جس میں ہم وقت دیکھتے ہیں، یہ ایک چولہا ہے جس پر کھانا پکتا، پورچ میں کھڑی کار سفر میں استعمال ہوتی ہے، لاؤنج میں رکھا فریج کھانے کو محفوظ رکھتا ہے۔۔

اب اس مکان کے ایک گوشے میں کوئی مذہبی علامت ہے تو اس کی اہمیت کا تعین کیسے کیا جائے گا ؟

یہیں پر توقف کیجیے کیا یہ تصویر اسی طرح ہے کہ جس انداز میں پیش کی گئی ہے اب اس منظر کو ہم پھر سے دیکھتے ہیں اور اشیاء کی قیمت کا تعین کرتے ہیں۔

کیا ڈرائنگ روم میں رکھا ہوا صوفہ لاؤنج میں رکھے ہوئے فریج سے زیادہ قیمتی ہوگا ؟ بظاہر تو ایسا دکھائی نہیں دیتا۔

کیا پورچ میں کھڑی کار لاؤنج میں رکھے فریج سے زیادہ قیمتی ہوگی ؟ بظاہر تو ایسا ہی دکھائی دیتا ہے۔

کیا تجوری میں رکھا سونا پورچ میں کھڑی کار سے زیادہ قیمتی ہوسکتا ہے ؟ ممکن ہے کہ اس کی مالیت کار سے زیادہ ہو۔

کیا سٹڈی روم میں موجود لیپ ٹاپ کے اندر محفوظ ڈیٹا ان سب چیزوں سے زیادہ اہم ہوسکتا ہے؟ یہ ڈیٹا کی نوعیت پر بیس کرتا ہے۔

لیکن کیا کوئی مادی فائدہ ہی قیمت کا تعین کرتا ہے؟

اب ہم ایک دوسرا منظر نامہ پیش کرتے ہیں اس گھر کے کسی ایک کمرے کی دیوار پر مونا لیزا لگی ہوئی کیا آپ کو معلوم ہے کہ اس کی کیا قیمت ہے ؟

بعض کے نزدیک ایک بلین ڈالر۔۔

اسی گھر میں ایک شرٹ ہے جو لیونل میسی یا رونالڈو نے کسی کلب کے میچ میں پہنی تھی اس کی کیا قیمت ہے؟

پس معلوم ہوا کہ کسی بھی چیز کی قیمت اس کے مادی فائدے کی ہی بنیاد پر نہیں ہوتی بلکہ اس کی جذباتی یا پھر جمالیاتی حیثیت بھی ہوا کرتی ہے یہاں پر مادی فائدے سے بڑھ کر جذباتی یا جمالیاتی پیمانوں پر قیمت کا تعین ہو رہا ہے۔

اب ایک اور منظر نامہ پیش کرتے ہیں اچانک کوئی پینڈامک نمودار ہوتا ہے اور اس گھر کے مکینوں کو اب گھر میں ہی موجود غذائی ذخیرے پر گزارہ کرنا ہوگا تو کیا وہ آٹا، دال، چاول، چینی، دودھ تمام تر مادی، جذباتی اور جمالیاتی چیزوں سے زیادہ قیمتی نہ ہو جائیں گے؟

تو کیا زندہ رہنا سب سے زیادہ اہم ہو جائے گا۔

پھر ایک اور منظر نامہ دیکھیے اسی گھر میں کسی کو اچانک ہارٹ اٹیک ہوتا ہے تو ان تمام چیزوں سے زیادہ وہ گولی اہم نہ ہوجائے گی کہ جو دل کے دورہ کے وقت زبان کے نیچے رکھی جاتی ہے؟

اب یہاں پر ایک ہیومنسٹ کھڑا ہوتا ہے اور وہ یہ دعویٰ کرتا ہے کہ سب سے اہم چیز خود انسان ہے، تو کیا اس کا یہ دعویٰ درست ہے؟

ایک مادیت پرست انسان بوڑھے والدین کو صرف اس لیے گھر سے نکال دیتا ہے کہ اب ان کی کوئی مادی قیمت نہیں رہی بلکہ وہ ایک لائیبلیٹی بن چکے ہیں تو کیا انسان واقعی اہم ہے؟

اب آپ کے سامنے ایک اور منظر نامہ پیش کرتے ہیں ایک معروف سرجن کے پاس پانچ مریض آتے ہیں ایک کو آنکھوں کی، ایک کو دل کی، ایک کو جگر کی، ایک کو گردوں کی اور ایک کو دماغ کی ضرورت ہے ان میں سے ایک ڈاکٹر ہے، ایک انجینئر ہے، ایک نیوکلیر فزکس سے منسلک ہے، ایک معروف اکانومسٹ ہے، ایک سپیس سائنس کا بندہ ہے ہر ہر شعبے کا فرد قیمتی اور اہم ہے اب اس ڈاکٹر کے پڑوس میں ایک ایسا شخص ہے کہ جس کا کوئی روزگار نہیں وہ زیادہ تر اپنے گھر میں رہتا ہے اس کی کوئی معاشی حیثیت نہیں اس کی کوئی معاشرتی افادیت نہیں اور اس کے نہ ہونے سے اس مادی دنیا کو کوئی بھی علمی، فکری، اخلاقی، مالی، جمالیاتی نقصان نہیں ہوگا اس کا کوئی رشتے دار بھی نہیں تو اس شخص کی کوئی جذباتی اہمیت بھی کسی کے لیے نہیں ہے۔

تو کیا وہ سرجن اس کا دل، اس کا دماغ، اس کی آنکھیں، اس کے گردے اس کا جگر زیادہ اہم زیادہ فعال زیادہ ضرورت مند افراد کو لگا سکتا ہے؟

اگر لگا سکتا ہے تو اس کے اقداری پیمانے کیا ہیں؟

اگر نہیں لگا سکتا تو اس کے اقداری پیمانے کیا ہیں ؟

اور اگر ہم بعض اخلاقی پیمانوں پر اسے غلط کہیں تو وہ اخلاقی پیمانے کیا ہیں؟ کیا شخصی آزادی کا پیمانہ؟

تو اگر اس پیمانے پر وہ شخص ایک مخصوص قیمت کی بنیاد پر اپنی خوشی سے اپنے اعضاء ان لوگوں کو دے دے تو کیا یہ درست ہوگا ؟

اور اگر یہ درست ہوگا تو ان اعضاء کے بغیر اس شخص کے لیے وہ قیمت کس طرح مفید ہوگی ؟

اب ایک اور منظر نامہ تخلیق کیجیے اس شخص کی ایک بیٹی ہے اور اسے اس بیٹی سے بہت محبت ہے اور وہ ان اعضاء کو بیچ کر اپنی بیٹی کے مستقبل کو محفوظ کر سکتا ہے تو کیا ایک پیمانہ محبت بھی ہے؟

اور اگر وہ شخص اس امید پر کہ وہ قیمت اس کی بیٹی کو مل ہی جائے گی اس دنیا سے چلا جاتا ہے تو کیا ضروری ہے کہ وہ سرجن وہ قیمت اس بچی کو دے ہی دے؟ کیا یہ صرف گڈ فیتھ نہیں ہے!

اب غور فرمائیے کہ ایک مادیت پرست ذہن کے پاس انسانیت کی سطح پر کوئی بھی متفق علیہ پیمانہ اس درجے کا موجود ہی نہیں کہ وہ کسی بھی شے کی حقیقی

قیمت کا تعین کر سکے یہاں تک کہ انسان کی قیمت بھی۔

تو پھر وہ کس جرات کے ساتھ مذہب اور خدا کی کوئی قدر اور کوئی قیمت متعین کرنے کا سوال پوچھ سکتے ہیں اور کس پیمانے پر اسے ماپ سکتے ہیں مالی، جذباتی، جمالیاتی وہ کون سا ایسا مکمل پیمانہ ان کے پاس موجود ہے کہ وہ مذہب اور خدا کی قیمت کا تعین کر سکیں۔

ہاں آخر میں ان کے پاس صرف گڈ فیتھ بچتا ہے اور یہی مذہب کا بنیادی مقدمہ ہے۔

تصور خدا اور کاملیت کی تلاش

ایک بار ایک ملحد نے مجھ سے ایک سوال کیا تھا وہ یوٹیلی ٹیرین تھا اور خدا کی اخلاقیات کی حدود متعین کر رہا تھا، اس نے پوچھا کہ وہ کیا وجہ ہے کہ خدا نے اس کائنات اور حضرت انسان کو کمزوریوں کا مجموعہ بنایا کیا خدا اتنا ہی کمزور ہے کہ وہ اس کائنات کو کامل بھی نہ بنا سکا؟

جب وہ یہ سوال کر چکا تو میں نے اس سے پوچھا کہ خدا کی اس کائنات میں یا خود انسان میں تمہیں جو خامیاں دکھائی دیتی ہیں اگر خدا کے تصور کو درمیان سے نکال دیا جائے تو پھر تم ان خامیوں یا کمیوں کی کون سی توجیہ کرو گے کیا فطرت ہی اپنی بنیاد میں خامی زدہ ہے؟ بڑی دیر سوچنے کے بعد بھی اس کے پاس اس سوال کا کوئی جواب نہیں تھا پھر اس نے دوسرا سوال پوچھا کہ اگر خدا کے ہونے یا نہ ہونے ہر دو صورت میں اس کائنات یا انسان کے اندر کوئی نہ کوئی خامی دکھائی دیتی ہے تو پھر ہم خدا کے تصور کو تسلیم کریں یا نہ کریں اس سے کیا فرق پڑتا ہے؟ تو اس پر میں نے اس سے یہ سوال کیا کہ انسان آخر کامل ہونے کا متلاشی ہی کیوں ہے وہ اس دنیا کو جنت کیوں دیکھنا چاہتا ہے اس کی یہ خواہش کیوں ہے کہ وہ ہمیشہ زندہ رہے اسے کوئی بیماری نہ ہو اس کی ہر ہر خواہش پوری ہو فطرت انسانی اپنی بنیاد میں خامی زدہ ہونے کے باوجود کاملیت کی متلاشی کیوں ہے کیا یہ تمام سائنسی تگ و دو یہ سارا کاروبار دنیا اسی کاملیت کی تلاش میں تو نہیں تو اس پر اس نے اس بات کا اقرار کیا کہ ایسا ہی ہے تو میں نے اس کے سامنے ایک نکتہ رکھا میں کہا کہ کبھی اس بات پر غور کرو کہ کیا کوئی وجود ایسا بھی ہو سکتا ہے کہ جو کامل ترین ہو اور ہم وقتی طور پر اس وجود سے دور ہو چکے ہیں لیکن ہم اس ایک کامل وجود کی تلاش میں ہوں ہمارے اردگرد مادیت کا ایک ڈھیر ہونے کے باوجود بھی ایک احساس نارسائی کیوں موجود ہے وہ کون ہے کہ جسے پالینے کی جستجو ہمیں چین نہیں لینے دیتی؟ بودھ سے لے کر مسیح تک کیا یہ ایک ہی طلب ایک ہی غم ایک ہی تلاش تو نہیں ہے اس بات پر وہ خاموش رہا تو میں نے اس کے سامنے ایک فطری نکتہ رکھا ہم نے اس دنیا کو تضادات سے سمجھا ہے خوشی غم سچ جھوٹ طاقتور کمزور خوبصورت بدصورت سرد گرم خیر و شر تو کیا انسان کا ہونا اس بات پر دلیل نہیں کہ کوئی خدا بھی ہے اور اگر ہے تو ہمارے اندر اس کو پالینے کی طلب عین فطری نہیں تو ہمارا ناقص ہونا کیا اس امر کو لازم نہیں کہ کوئی کامل بھی ہے اور ہماری اس کائنات کا عارضی ہونا کیا اس بات کو لازم نہیں کہ کہیں کوئی دنیا دائمی بھی ہے اور یہاں پر ہمارا معدوم ہو جانا کیا اس بات کی دلیل نہیں کہ کہیں پر ہم لافانی بھی ہوں گے اور یہاں پر ہماری گفتگو ختم ہو گئی مجھے اس کی آنکھیں بتا رہی تھیں کہ اس کے اندر سوچ کا ایک در وا ہو چکا ہے۔

مسئلہ خیر و شر اور الحاد

حقیقت تو یہ ہے کہ خیر و شر کا ہر تصور مذہب نے ہی پیش کیا ہے مذہب سے ہٹ کر اس تصور کی کوئی تاریخ موجود نہیں ہے۔

فطرت انسانی نے کبھی خیر و شر کا تعین نہیں کیا چونکہ ایک ملحد خاص کر نیچری ملحد کے نزدیک انسان بھی اپنی بنیاد میں حیوان ہی ہے یا پھر حیوان کی ترقی یافتہ شکل ہی ہے تو سوال یہ ہے کہ جب وہ سروائیول آف دی فٹسٹ کے تصور کو مانتے ہیں تو اس کی موجودگی میں کسی بھی اخلاقی یا اصولی تصور کو کیسے تسلیم کر سکتے ہیں۔

اب اس نکتے کو مثال سے سمجھاتا ہوں جنگل کا شیر کسی اخلاقی پیمانے کا پابند نہیں ہوتا ہرن کا شکار اس کی فطرت ہے اگر وہ کسی اخلاقی پیمانے پر شکار چھوڑ دے تو یہ اس کی فطرت کے مخالف ہوگا اور اس کی بقاء بھی خطرے میں پڑ جائے گی۔

ایک نیچری ملحد از خود ایک اخلاقی پوزیشن تخلیق کرنے کی کوشش کرتا ہے مثال کے طور پر وہ ایک ایک نیچری اور سبزی خور ملحد ہے تو اس کے نزدیک جانوروں کا کھانا ظلم ہے مگر رکیے کیا بلی کا چوہے کو کھا جانا بھی جرم ہے؟

مخمصہ در مخمصہ اگر جانوروں کا کھانا جرم ہے تو پودوں کا کھانا جرم کیوں نہ ہوا کیا پودے جاندار نہیں ہیں؟

ویسے تو ماس نہ کھانے کا تصور بھی انھوں نے مذہب سے ہی مستعار لیا ہے، خیر و شر کے اخلاقی تصور کی کوئی بھی بنیاد مذہب سے ہٹ کر ممکن ہی نہیں انسانی شعور کی تاریخ یہ بتاتی ہے کہ ہمیشہ یہ تصور مذہب کی طرف سے ہی آیا ہے۔

غیر مذہبی یا غیر شعوری وجود کی کوئی بھی اخلاقی پوزیشن نہیں ہو سکتی ایک شیر، بکری، چوہا، بلی، گاجر، مولوی یا پھر ایک ایپ ایک نینڈر تھا یا ایک ملحد جب وجود کی بقاء کے فکری قانون کو تسلیم کرتے ہیں تو پھر وہ خیر و شر کی کسی اخلاقی پوزیشن کے طالب کس طرح ہو سکتے ہیں؟

الحاد کا تصور آزادی

کلی آزادی یہ ہمیشہ انسان کی خواہش رہی ہے

مگر کیا کیجیے انسان مقید ہے آپ لاکھ انکار کیجیے حیلے بہانے تراشیں لیکن آپ مجبور ہیں

انسان قیدی ہے، انسان کا

انسان قیدی ہے اپنے مادی وجود کا
انسان قیدی ہے اپنے جذبات و احساسات کا
انسان قیدی ہے اپنے ماحول کا
انسان قیدی ہے اپنے افکار کا

کہیں خونی رشتے آپ کے پیر کی دیوار ہیں تو کہیں ریاستی قوانین آپ کے راستے کی رکاوٹ، کہیں آپ کا کمزور وجود آپ کی خواہشات کو پورا کرنے میں ناکام تو کہیں آپ کے جذبات آپ کی فکری پرواز میں مزاحم۔

کیا خوب کہا ہے شاعر نے

ناحق ہم مجبوروں پر یہ تہمت ہے مختاری کی
چاہتے ہیں سو آپ کریں ہیں ہم کو عبث بدنام کیا

خدا کا آپ سے ایک ہی مطالبہ ہے دیکھو میری غلامی میں آجاؤ اور آپ کی یہی رٹ میں نہ مانوں۔

غور کیجئے! کیا آپ اپنے اردگرد موجود مادی حدود و قیود کو توڑ سکتے ہیں؟ اس لا محدود پھیلی ہوئی کائنات میں آپ کی پرواز کہاں تک ہے، پھر آپ کی جسمانی کمزوریاں کیا آپ ہمیشہ جاگ سکتے ہیں یا ہمیشہ سو سکتے ہیں کیا آپ غم خوشی دکھ تکلیف سے مبرا ہو سکتے ہیں؟

پھر آپ پر زمینی حدود کی پابندیاں یہ پاکستان ہے یہ ہندوستان یہ امریکہ یہ انگلستان یہ کوریا یہ جاپان۔

کبھی کسی ملحد نے اس پر اعتراض کیوں نہیں کیا؟ ہاں جہاں مذاہب کی حدود کی بات آئی پھر میں نہ مانوں کی تکرار۔

آپ کی مرضی مت مانئے آپ کے ماننے یا نہ ماننے سے حقائق تبدیل نہیں ہوتے۔

پھر ہر شخص دوسرے شخص کا قیدی میری آزادی وہاں ختم ہوتی ہے جہاں سے آپ کی ناک شروع ہوتی ہے ایسا کیوں جناب آپ کی آزادی وہاں کیوں ختم نہیں ہوتی جہاں مذہب کی حد شروع ہوتی ہے۔

کبھی آپ بچے تھے تو آپ کے ماں باپ نے آپ کی پرورش کی استادوں نے آپ کو پڑھایا کتابوں میں لکھے نے آپ کو سکھایا دنیا کے مشاہدے نے آپ کو سمجھایا۔

تو سوال یہ ہے کہ آپ کہاں ہیں آپ کون ہیں آپ کی اپنی حیثیت کیا ہے؟

ایک عظیم الشان فطری کارخانے کے ایک کارندے جو اس مشین میں چل رہا ہے اور اس کا اس مشین سے نکلنا ممکن ہی نہیں۔

آپ لاکھ کہیں میں آزاد ہوں لیکن کیا کیجئے
آپ صرف ایک غلام ہیں فطرت کے غلام
اب فیصلہ آپ کا ہے کہ آپ کو کس کا غلام بننا ہے
اپنی بے لگام خواہشات کا یا پھر
ایک سچے حقیقی رب کا

ایمان و الحاد کی فلسفیانہ و فکری بنیادیں

ایمان کا بنیادی مطالبہ ہی یہ ہے کہ کسی اَن دیکھی قوت کو تسلیم کیا جائے کہ جو عقل کے دائرے سے اوپر ہے ایمانیات تمام تر ما بعد الطبیعیات یعنی سپر نیچرل سے متعلق ہیں ایمان یہ تقاضا کرتا ہے کہ موجودات سے ہٹ کر یا ان سے اوپر موجودات کے ایک دوسرے دائرے کو تسلیم کیا جائے کہ جو بظاہر دکھائی نہیں دیتا لیکن محسوس کیا جا سکتا ہے۔

عقل پرست یا موجودہ دور میں سائنس پرست الحاد کا دعویٰ یہ ہے کہ جو کچھ دکھائی دیتا ہے جس پر تجربہ ممکن ہے یا پھر جس کا تجربہ ہو سکتا ہے وہی حقیقت ہے اور وہی موجود ہے یا پھر حقیقت وہی ہے کہ جس تک انسان پہنچا ہے۔

مذہبی دعوت بہت صاف اور واضح ہے کہ یہ کائنات ایک مخصوص مقصد کے لیے تخلیق کی گئی ہے اور یہ دنیا صرف ایک عبوری گزرگاہ ہے اس دنیا سے پرے ایک اور دنیا ہے کہ جو مستقل اور ہمیشہ رہنے والی ہے، انسان کو اس دنیا یا اس دنیا میں ایک خاص حیثیت حاصل ہے اور انسان سے بنیادی مطالبہ یہ ہے کہ وہ اپنے خالق کو پہچان کر اس کی اطاعت کرے بلکہ سچائی تو یہ ہے کہ جو خالق کو پہچان کر اس کی اطاعت کرے وہی انسان ہے۔

دوسری جانب الحاد و تشکیک کے پاس سرے سے کوئی دعویٰ ہے ہی نہیں تشکیک تو خیر ایک غیر عقلی اور غیر فطری پوزیشن ہے لیکن الحاد یا موجودہ دہریت بھی مذہب کے مقابل صرف اور صرف الزامی کیفیت پر کھڑے ہیں آج تک معاصر الحاد و دہریت نے اپنی دعوت یا اپنا کوئی ذاتی دعویٰ پیش نہیں کیا بلکہ اس کی مکمل بنیادیں رد کی نفسیات پر قائم ہیں یعنی اگر مذہب نہ ہو تو الحاد کا وجود بھی باقی نہیں رہتا دوسرے لفظوں میں الحاد کو اپنی وجود کے لیے مذہب کی ضرورت ہے کہ جسے وہ رد کر سکے۔

آپ کسی ملحد سے دریافت کریں کہ بتاؤ تمہاری بنیادی دعوت اور بنیادی دعویٰ کیا ہے؟

تو وہ کبھی سیکولرزم کے پیچھے چھپے گا، کبھی ہیومنزم کی آڑ لے گا، کبھی فیمینزم کے پردے میں ظاہر ہوگا، کبھی سائنٹزم کی دعوت دے گا، کبھی وہ عالمگیری ہوگا، کبھی ٹوٹیلیٹیرین ہوگا، کبھی رومانٹسزم دکھائی دے گا تو کبھی پریگمیٹک بن جائے گا لیکن یہ سب اسے کسی نہ کسی درجے میں ایک کریٹیکل تھنکر کی سطح سے اوپر نہیں لے جا سکتے۔

الحاد و دہریت کی سرے سے کوئی اخلاقی، فکری، نظریاتی، تہذیبی، ثقافتی یہاں تک کہ کوئی علمی بنیادیں نہیں ہیں یہ کوئی مستقل تصور حیات بھی نہیں ہے اسی لیے یہ دھوکا ضرور دیتا ہے اور مختلف تصورات ضرور پیش کرتا ہے لیکن اس کی بنیادی دعوت سرے سے کچھ بھی نہیں۔

اپنی اسی غیر فطری اپروچ کی وجہ سے ہزاروں سال کے فکری ارتقاء کے باوجود آج بھی الحاد و دہریت مذہب سے دس قدم پیچھے ہیں اور سچ تو یہ ہے کہ ہمیشہ رہیں گے۔

✳ ✳ ✳ ✳ ✳

الشیخ کرم الٰہی

سرزمین شام

فضائل و برکات اور رسول اللہ ﷺ کی بشارتیں

۸ دسمبر ۲۰۲۴ء کو پیش آنے والے انقلاب کے بعد سرزمینِ شام کے بارے میں لوگوں کی دلچسپی میں اضافہ ہوا ہے۔ اس لیے درج ذیل سطور میں عوام کی آگاہی کے لیے قرآن و حدیث کی روشنی میں سر زمینِ شام کی اہمیت وفضیلت پیش خدمت ہے، تاکہ لوگ اس کی تاریخی، ثقافتی اور دینی اہمیت کو بہتر طور پر سمجھ سکیں۔

سرزمینِ شام کا تعارف اور جغرافیائی حدود

شام ایک تاریخی اسلامی ملک ہے جو مغربی ایشیا میں واقع ہے۔ اس کے شمال میں ترکی، جنوب میں اردن، مشرق میں عراق، مغرب میں لبنان اور بحیرۂ روم، جبکہ جنوب مغرب میں مقبوضہ فلسطین موجود ہیں۔ حضرت نوح علیہ السلام کے بڑے بیٹے سام کے نام پہ آباد ہونے والے ملک شام کو انگریزی میں syria عربی میں سوریا اور سریانی میں شام کہتے ہیں۔ طوفان نوح کے بعد سام بن نوح اسی علاقے میں آباد ہوئے تھے۔ اس لیے یہ علاقہ شام کے نام سے مشہور ہوگیا۔ غیر منقسم ملک شام پر ۶۳۶ عیسوی سے ۱۹۲۰ء تک مسلمانوں کی حکومت رہی۔ سنہ ۱۹۲۰ء میں شریفِ مکہ کی غداری کی وجہ سے خلافتِ عثمانیہ کا خاتمہ ہوگیا اور شام فرانس کے قبضہ میں چلا گیا جس نے شام کو چار الگ الگ سرحدوں سوریا، لبنان، فلسطین اور اردن میں بانٹ دیا۔ سنہ ۱۹۴۶ء میں تقسیم شدہ سوریا کو فرانسیسی استعماریت سے آزادی ملی اور حافظ امین اس کا سربراہ بنا۔ سنہ ۱۹۷۰ء میں حافظ الاسد نے ایک فوجی بغاوت کے ذریعہ حافظ امین سے زمام حکومت اپنے ہاتھ میں لے لیا۔ سنہ ۲۰۰۰ء میں حافظ الاسد کا انتقال ہوا تو اس کا بیٹا بشار الاسد ملکِ شام کا صدر بن گیا اور ۸ دسمبر ۲۰۲۴ء بشار الاسد کے ۲۴ سالہ اقتدار کا خاتمہ ہوا اور انبیاء کی یہ سرزمین بشار کے ظلم و زیادتیوں سے آزاد ہوگئی۔ قرآن و حدیث کی روشنی میں جب ملکِ شام کی بات ہوتو اس سے چار ممالک (سوریا، لبنان، فلسطین، اردن) مراد ہوں گے کیونکہ رسول اللہ ﷺ کی حیاتِ مبارکہ اور بعد میں جس خطے کے لیے بلادِ شام کہا جاتا تھا وہ ان ہی چار ممالک پر مشتمل تھا۔ بلادِ شام میں فلسطین کا شہر بیت المقدس اور سوریا کا شہر دمشق تاریخی اور شرعی اعتبار سے کافی فضیلت کا حامل ہے۔

رسول اللہ ﷺ کی سرزمین شام میں دل چسپی

رسول اللہ ﷺ نے مسلمانوں کی توجہ سر زمینِ شام کی فتح کی جانب اس وقت سے مبذول کروانا شروع کر دی تھی جب ۸ ہجری میں غزوہ موتہ پیش آیا۔ اس کے بعد ۹ ہجری میں غزوہ تبوک اور ۱۱ ہجری میں حضرت اسامہ بن زید رضی اللہ عنہ کی قیادت میں ایک مہم تیار کی گئی، جو حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کے دورِ خلافت تک مؤخر رہی۔ پھر حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے ۱۳ ہجری میں حج سے واپسی کے بعد شام کی جانب مہمات روانہ کرنا شروع کیں۔ بالآخر حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ کے دورِ خلافت میں شام فتح ہوا۔ اس فتح کے بعد بازنطینی (رومی) افواج وہاں سے نکل گئیں اور ان کے حامی بھی ان کے ساتھ چلے گئے۔ اس کے بعد شام اسلامی ریاست کا حصہ بن گیا اور اسلامی تاریخ میں ایک مرکزی حیثیت اختیار کر گیا۔ یہاں تک کہ اموی خلافت کے دوران، دمشق اسلامی سلطنت کا دار الحکومت بن گیا۔

سرزمینِ شام نا صرف جغرافیائی طور پر اہمیت رکھتی ہے، بلکہ اس کے روحانی اور دینی اعتبار سے بھی بہت زیادہ فضائل ہیں۔

درج ذیل سطور میں قرآن و حدیث کی روشنی میں بلادِ شام کی مقدس سرزمین کی فضیلت، اس کے جغرافیائی اور تاریخی اہمیت اور رسول اللہ ﷺ کی بشارتوں کے بارے میں تفصیل سے جانیں گے تاکہ ہمیں اندازہ ہو سکے کہ یہ سرزمین آخر کیوں کر اتنی اہم ہے۔

① - بابرکت مقام

قرآن مجید میں کئی ایک ایسے مقامات ہیں جو بلادِ شام کی فضیلت پر دلالت کرتے ہیں۔ ارشادِ باری تعالی ہے:-

وَنَجَّيْنٰهُ وَلُوْطًا اِلَى الْاَرْضِ الَّتِيْ بٰرَكْنَا فِيْهَا لِلْعٰلَمِيْنَ (الأنبياء: ۷۱)

"اور ہم نے ابراہیم علیہ السلام اور لوط علیہ السلام کو اسی سر زمین میں پناہ دی کہ جسے ہم نے اہلِ دنیا کے لیے با برکت بنایا ہے۔"

امام ابن جریر طبری رحمہ اللہ فرماتے ہیں:-

"وهي أرض الشأم، فارق صلوات الله عليه

وقومه ودينهم وهاجر إلى الشأم-" (جامع البیان عن تاویل آی القرآن، الأنبیاء: ۷۱)

ترجمہ: "یہ سرزمینِ شام ہے، جہاں حضرت ابراہیم علیہ السلام اور لوط علیہ السلام نے اپنی قوم اور ان کے دین کو چھوڑا اور شام کی طرف ہجرت کی۔"

عبدالرحمن بن ناصر السعدی رحمہ اللہ فرماتے ہیں:-

"أي: الشام، فغادر قومه في "بابل" من أرض العراق-" (تفسیر سعدی، الأنبیاء: ۷۱)

یعنی: "اس سے مراد ملکِ شام ہے، یعنی وہ اپنی قوم کو "بابل" یعنی عراق میں چھوڑ کر شام کی طرف ہجرت کر گئے۔"

تمام اہلِ علم کا اس بات پر اتفاق ہے کہ اس آیت سے مراد سرزمینِ شام ہے کیونکہ حضرت ابراہیم علیہ السلام اور لوط علیہ السلام کی ہجرت عراق سے شام کی طرف تھی۔

اسی طرح جہاں اللہ تعالیٰ نے سیدنا سلیمان علیہ السلام کا تذکرہ کیا، وہاں اس سرزمین کو با برکت سرزمین کہتے ہوئے فرمایا:-

وَلِسُلَيْمَانَ الرِّيحَ عَاصِفَةً تَجْرِي بِأَمْرِهِ إِلَى الْأَرْضِ الَّتِي بَارَكْنَا فِيهَا (الانبیاء: ۸۱)

"اور سلیمان علیہ السلام کے لیے ہم نے تند و تیز ہوا کو بھی تابع بنا دیا تھا جو ان کے حکم سے اس سرزمین کی طرف چلتی تھی جس میں ہم نے برکت رکھی تھی۔"

امام قرطبی اس آیتِ مبارکہ کی تفسیر میں فرماتے ہیں:-

"إلى الْأَرْضِ الَّتِي بَارَكْنَا فِيهَا، يَعْنِي الشَّامَ-" (تفسیر قرطبی: ۱۱/ ۳۲۲)

یعنی: "اس با برکت سرزمین سے مراد شام ہے۔"

② - رسول اللہ ﷺ کی خصوصی دعا

ارضِ شام وہ مبارک سرزمین ہے جس کے لیے رسول اللہ ﷺ نے خاص طور پر برکت کی دعا فرمائی۔ سیدنا عبد اللہ بن عمر رضی اللہ عنہما بیان کرتے ہیں کہ اللہ کے رسول ﷺ نے یہ دعا فرمائی:-

"اللَّهُمَّ بَارِكْ لَنَا فِي شَأْمِنَا، اللَّهُمَّ بَارِكْ لَنَا فِي يَمَنِنَا قالوا: يا رَسولَ اللهِ، وفي نَجْدِنَا؟ قالَ: اللَّهُمَّ بَارِكْ لَنَا فِي شَأْمِنَا، اللَّهُمَّ بَارِكْ لَنَا فِي يَمَنِنَا قالوا: يا رَسولَ اللهِ، وفي نَجْدِنَا؟ فَأَظُنُّهُ قالَ في الثَّالِثَةِ: هُنَاكَ الزَّلَازِلُ والفِتَنُ، وبِهَا يَطْلُعُ قَرْنُ الشَّيْطَانِ-" (صحیح البخاری: ۷۰۹۴)

ترجمہ: "اے اللہ! ہمارے شام اور یمن پر برکت نازل فرما۔ اس پر صحابہؓ نے کہا: اے اللہ کے رسول (ﷺ)! ہمارے نجد کے لیے بھی برکت کی دعا کیجیے لیکن آپ نے پھر وہی کہا: "اے اللہ! ہمارے شام اور یمن پر برکت نازل فرما۔" صحابہؓ نے پھر عرض کی: اے اللہ کے رسول (ﷺ)! ہمارے نجد کے لیے بھی برکت کی دعا کیجیے؟ راوی کہتے ہیں کہ غالباً تیسری مرتبہ اللہ کے رسول ﷺ نے (نجد میں برکت کی دعا کی درخواست پر) فرمایا کہ وہاں تو زلزلے اور فتنے ہوں گے اور شیطان کا سینگ وہی سے طلوع ہوگا۔"

③ - انبیاء کرام کا مرکز

سرزمینِ شام کو یہ اعزاز حاصل ہے کہ یہاں کثرت سے انبیاء کرام کو مبعوث فرمایا گیا چنانچہ امام مناوی رحمہ اللہ فرماتے ہیں:-

"وأكثر الأنبياء بعثوا منها فانتشرت في العالمين شرائعهم-" (فیض القدیر للمناوی: ۴/ ۱۷۱)

"اکثر انبیاء کرام اسی سرزمین سے بھیجے گئے، اور یہیں سے دین کی دعوت دنیا میں پھیلی۔"

نیز دیگر کئی علاقوں سے انبیاء کرام نے ہجرت فرما کر اس علاقے کو اپنا مسکن بنایا، جن میں سے سیدنا ابراھیم، سیدنا اسحاق، سیدنا یعقوب، سیدنا یوشع علیہم السلام قابلِ ذکر ہیں۔ اور سیدنا موسیٰ علیہ السلام نے تو اس سرزمین پر اپنی موت کے لیے اللہ تعالیٰ سے دعا کی تھی:-

"فَسَأَلَ اللَّهَ عَزَّ وَجَلَّ أَنْ يُدْنِيَهُ مِنَ الْأَرْضِ الْمُقَدَّسَةِ رَمْيَةً بِحَجَرٍ-" (أخرج البخاری: ۱۳۳۹، ومسلم: ۲۳۷۲)

"سیدنا موسیٰ علیہ السلام نے اللہ تعالیٰ سے یہ دعا کی کہ مجھے ایک پتھر پھینکنے کے فاصلے تک مقدس سرزمین کے قریب کر دیا جائے۔"

علامہ مہلب رحمہ اللہ فرماتے ہیں:-

"سیدنا موسیٰ علیہ السلام نے انبیاء کے پہلو میں دفن ہونے کی تمنا اس لیے کی تھی کہ میدانِ حشر کے قریب ہو جائیں اور اس مشقت سے بچ جائیں جو دور رہنے کی صورت میں پیش آ سکتی ہے، کیونکہ سرزمینِ شام ہی نے میدانِ محشر کی شکل اختیار کرنی ہے۔" (فتح الباری: ۳/ ۲۶۴)

④ - سرزمینِ محشر

ارض شام قیامت کے دن حشر و نشر کی جگہ بنے گی۔ قیامت کے قریب ایک آگ لوگوں کو میدانِ محشر کی طرف دھکیلتے ہوئے لے جائے گی اور یہ آگ صبح، دوپہر اور شام ہر وقت ان کے ساتھ رہے گی، یہاں تک کہ وہ انھیں میدانِ محشر تک پہنچا دے گی۔ یہ میدانِ محشر ارضِ شام میں قائم ہوگا۔ وہیں لوگ جمع ہوں گے اور ان سے حساب لیا جائے گا۔ سیدنا عبد اللہ بن عمر رضی اللہ عنہما بیان فرماتے ہیں:-

"أَنَّ مَوْلَاةً لَهُ أَتَتْهُ فقالتْ اشْتَدَّ عليَّ الزَّمانُ وإنِّي أُرِيدُ أنْ أَخْرُجَ إلى العراقِ قال فَهَلَّا إلى الشَّأْمِ أرضِ المَنْشَرِ اصْبِرِي لَكَاعِ فإنِّي سَمِعْتُ رسولَ اللهِ ﷺ يقولُ مَنْ صَبَرَ على شِدَّتِها ولَأْوَائِها كُنْتُ لهُ شَهِيدًا أوْ شَفِيعًا يومَ القيامةِ-" (سنن الترمذی: ۳۹۱۸، وقال الألبانی: صحیح)

"ان کی ایک آزاد کردہ لونڈی ان کے پاس آئی اور ان سے کہنے لگی میں گردشِ زمانہ کی شکار ہوں اور عراق جانا چاہتی ہوں، تو انھوں نے کہا: تو شام کیوں نہیں چلی جاتی جو حشر و نشر کی سرزمین ہے اور صبر کر اے نالائق! کیونکہ میں نے رسول اللہ ﷺ کو فرماتے ہوئے سنا ہے: جس نے مدینہ کی سختی اور تنگی معیشت پر صبر کیا تو میں قیامت کے دن اس کے لیے

گواہ یا سفارشی بنوں گا۔"

اسی طرح حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:-

"إنّكم تُحشرونَ رجالًا و رُكبانًا، وتُجَرُّونَ علَى وجوهِكم ههنا وأومَأَ بيَدِهِ نحوَ الشامِ۔" (صحیح الجامع: ۲۳۰۲)

ترجمہ: "تم سوار، پیدل اور منہ کے بل گھسیٹتے ہوئے اکٹھے کیے جاؤ گے، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ کہتے ہوئے اپنے ہاتھ سے ملکِ شام کی طرف اشارہ کیا۔"

ایک اور حدیث میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:-

"الشامُ أرضُ المحشرِ و المنشرِ۔" (صحیح الجامع: ۳۷۲۶)

ترجمہ: "سر زمینِ شام حشر و نشر کی سرزمین ہے۔"

امام مناوی رحمہ اللہ فرماتے ہیں:-

"أي البقعة التي يجمع الناس فيها إلى الحساب وينشرون من قبورهم ثم يساقون إليها، وخصت بذلك لأنها الأرض التي قال الله فيها: بَارَكْنَا فِيهَا لِلْعَالَمِينَ (سورة الأنبياء: ۷۱) وأكثر الأنبياء بعثوا منها فانتشرت في العالمين شرائعهم فناسب كونها أرض المحشر والمنشر۔" (فیض القدیر للمناوی: ۴/۱۷۱)

ترجمہ: "یعنی وہ مقام ہے جہاں لوگوں کو حساب کے لیے جمع کیا جائے گا اور لوگوں کو ان کی قبروں سے اٹھا کر اسی مقام کی طرف لایا جائے گا، اور شام کو اس لیے خاص کیا گیا ہے کیونکہ یہ وہ سرزمین ہے جس کے بارے میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ہم نے اس میں تمام جہانوں کے لیے برکت دی ہے۔ اور زیادہ تر انبیاء کرام اسی سرزمین سے بھیجے گئے اور یہیں سے دین کی دعوت دنیا میں پھیلی تو اس لیے مناسب تھا کہ شام کی سرزمین کو ارضِ محشر قرار دیا جائے۔"

⑤- فرشتوں کی نگرانی

قربِ قیامت سرزمینِ شام فرشتوں کی حفاظت اور نگرانی میں ہوگا۔ حضرت زید بن ثابت رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں:-

"كُنَّا عِندَ رسولِ اللهِ ﷺ نؤلِّفُ القرآنَ منَ الرقاعِ فقال رسولُ اللهِ ﷺ طوبى للشامِ فقلْنا لأيٍّ ذلكَ يا رسولَ اللهِ قال لأن ملائكةَ الرحمنِ باسطةٌ أجنحتَها عليْها۔" (صحیح الترمذی: ۳۹۵۴)

ترجمہ: "ہم لوگ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس کاغذ کے پرزوں سے قرآن کو مرتب کر رہے تھے تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: خوشخبری ہے شام کے لیے، صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کہتے ہیں کہ ہم نے کہا: وہ کیوں؟ تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: شام پر اللہ کے فرشتوں نے (حفاظت کے لیے) اپنے پر پھیلا رکھے ہیں۔"

⑥- دین کے مددگار

فتنوں کے دور میں اہلِ شام دین کے مددگار ہوں گے۔ سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو فرماتے سنا:-

"إذا وقعتِ الملاحِمُ، بعثَ اللهُ من دمشق بعثًا منَ الموالي، هم أكرمُ العربِ فرَسًا، وأجودُهُ سلاحًا، يؤيِّدُ اللهُ بهِمُ الدِّينَ۔" (صحیح ابن ماجہ: ۳۳۰۳، والسلسلہ الصحیحہ: ۲۷۷۷)

ترجمہ: "جب بڑی بڑی جنگیں ہونے لگیں گی تو اس وقت اللہ تعالیٰ دمشق سے نومسلم لوگوں میں سے ایک لشکر کو بھیجے گا، وہ تمام عربوں میں عمدہ ترین شہسوار اور آلاتِ حرب کی مہارتِ تامّہ رکھنے والے ہوں گے۔ اللہ ان کے ذریعے دین کی مدد فرمائے گا۔"

⑦- ایمان اور سلامتی کی سرزمین

فتنوں کے دور میں شام کی سرزمین سلامتی اور ایمان کی سرزمین ہوگی۔ حضرت ابو درداء رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:-

"بَينا أنا نائمٌ إذ رَأيتُ عَمودَ الكِتابِ احتُمِلَ من تَحتِ رَأسي، فظَنَنتُ أنَّه مَذهوبٌ به، فأتبَعْتُه بَصَري، فعُمِدَ به إلى الشَّامِ، ألَا وإنَّ الإيمانَ حينَ تَقَعُ الفِتَنُ بالشَّامِ۔" (صحیح الترغیب: ۳۰۹۴)

ترجمہ: "ایک مرتبہ میں سو رہا تھا کہ خواب میں میں نے کتاب (اسلام) کے ستونوں کو دیکھا کہ انھیں میرے سر کے نیچے سے اٹھایا گیا، میں سمجھ گیا کہ اسے لے جایا جا رہا ہے چنانچہ میری نگاہیں اس کا پیچھا کرتی رہیں پھر اسے شام پہنچا دیا گیا۔ یاد رکھو! جس زمانے میں فتنے رونما ہوں گے اس وقت ایمان شام میں ہوگا۔"

یعنی قربِ قیامت مسلمانوں کا وطن شام ہو گا اور یہ اس بات کی دلیل ہے کہ آخری وقت میں شام کی سرزمین میں امن و ایمان کو استحکام ملے گا تاکہ جب مسلم ممالک میں ہر جگہ فتنہ برپا ہو جائے تو مومن اس کی طرف جا سکیں۔

⑧- اللہ کی حفاظت میں

اہلِ شام اللہ کی حفاظت میں رہیں گے اور وہاں کے رہنے والوں کو اللہ فتنے کے ذریعہ ہلاک نہیں کرے گا۔ حضرت عبد اللہ بن حوالہ رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:-

"سيصيرُ الأمرُ إلى أن تَكونوا جُنودًا مُجنَّدةً جُندٌ بالشَّامِ، وجندٌ باليمنِ و جُندٌ بالعراقِ قالَ ابنُ حوالةَ: خِر لي يا رسولَ اللهِ إن أدرَكْتُ ذلِكَ، فقالَ: عليكَ بالشَّامِ، فإنَّها خيرةُ اللهِ من أرضِهِ، يَجتبي إليها خيرتَهُ من عبادِهِ، فأمَّا إن أبيتُمْ، فعليكُم بيمَنِكُم، واسقوا من غُدُرِكُم، فإنَّ اللهَ توَكَّلَ لي بالشَّامِ وأَهْلِهِ۔" (صحیح أبی داود: ۲۴۸۳)

ترجمہ: "عنقریب ایسا وقت آئے گا کہ تم الگ الگ ٹکڑیوں میں بٹ جاؤ گے، ایک ٹکڑی شام میں، ایک یمن میں اور ایک عراق میں"۔ ابن حوالہ نے کہا: اللہ کے رسول (صلی اللہ علیہ وسلم)! مجھے بتائیے اگر میں وہ زمانہ پاؤں تو کس ٹکڑی میں رہوں، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "اپنے اوپر شام کو لازم کرلو، کیونکہ شام کا ملک اللہ کی بہترین سرزمین ہے، اللہ اس ملک میں اپنے نیک بندوں کو جمع کرے گا، اگر شام میں نہ رہنا چاہو تو

اپنے یمن کو لازم پکڑنا اور اپنے تالابوں سے پانی پلانا کیونکہ اللہ نے مجھ سے شام اور اس کے باشندوں کی حفاظت کی ذمہ داری لی ہے۔"

⑨- سب سے بہترین لوگ

سرزمینِ شام کی طرف ہجرت کرنے والے دنیا کے سب سے بہترین لوگ ہوں گے۔ سیدنا عبد اللہ بن عمرو بن عاص رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:-

"ستكونُ هجرةٌ بعدَ هجرةٍ، فخِيارُ أهلِ الأرضِ أَلْزَمُهُم مُهاجَرَ إبراهيمَ، ويَبْقى في الأرضِ شِرَارُ أهلِها، تَلْفِظُهُم أَرْضُوهُم، وتَقْذَرُهُم نَفْسُ اللهِ، وتَحْشُرُهُمُ النارُ مع القِرَدَةِ والخَنازيرِ۔" (السلسلۃ الصحیحۃ: ۳۲۰۳)

ترجمہ: "عنقریب یکے بعد دیگرے ہجرتیں ہوتی رہیں گی، بہترین اہلِ زمین وہ ہوں گے جو ابراہیم علیہ السلام کی ہجرت گاہ (شام) کو لازم پکڑے رکھیں گے، اس وقت زمین میں بدترین لوگ باقی رہ جائیں گے، ان کی زمین ان کو پھینک دے گی یعنی وہ ایک ملک سے دوسرے ملک بھاگتے پھریں گے، اللہ تعالیٰ ان سے نفرت کرے گا، آگ ان لوگوں کو بندروں اور خنزیروں کے ساتھ اکٹھا کرے گی۔"

یہ بات تو سب کو معلوم ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے ارضِ شام کی طرف ہجرت کی تھی۔

⑩- عیسیٰ رضی اللہ عنہ کا جائے نزول

قیامت کے قریب حضرت عیسیٰ علیہ السلام عادل حکمران کے طور پر آسمان سے اتریں گے اور سرزمینِ شام میں نازل ہوں گے، سیدنا اوس بن اوس ثقفی رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ انھوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یوں فرماتے ہوئے سنا:-

"ينزل عيسى بن مريم علیہما السلام عند المنارةِ البيضاء شرقي دمشق۔" (صحیح الجامع: ۸۱۶۹)

"قیامت کے قریب عیسیٰ بن مریم علیہما السلام دمشق کے مشرقی جانب سفید مینار کے پاس آسمان سے اتریں گے۔"

ایک اور حدیث کے اندر سیدنا نواس بن سمعان رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ ایک صبح رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے دجال کا ذکر کرتے ہوئے فرمایا:-

"إذ بعثَ اللهُ عيسى ابنَ مريمَ، فينزلُ عندَ المَنارةِ البيضاءِ، شَرقيَّ دمشقَ، بينَ مَهْرودتينِ، واضعًا كفَّيهِ على أجنحةِ ملَكَينِ۔" (صحیح مسلم: ۲۹۳۷)

ترجمہ: "جب اللہ تعالیٰ عیسیٰ بن مریم علیہما السلام کو مبعوث فرما دے گا تو وہ دمشق کے مشرقی جانب سفید مینار کے پاس آسمان سے اتریں گے۔ اس وقت وہ ہلکے زرد رنگ کی دو چادروں میں ملبوس ہوں گے اور اپنے دونوں ہاتھ دو فرشتوں کے بازوؤں پر رکھے ہوئے ہوں گے۔"

⑪- دجال کا جائے قتل

دجال شام ہی میں ہلاک ہو جائے گا۔ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے قیامت کی نشانیاں بیان کرتے ہوئے فرمایا:-

"الإيمانُ يمانٍ والكفرُ من قبلِ المشرقِ والسَّكينةُ لأهلِ الغنمِ والفخرُ والرِّياءُ في الفدَّادينَ أهلِ الخيلِ وأهلِ الوبرِ يأتي المسيحُ - أي الدجال- إذا جاءَ دبرَ أحدٍ صرفتِ الملائِكةُ وجْهَهُ قبلَ الشَّامِ وهنالِكَ يَهلِكُ۔" (صحیح الترمذی: ۲۲۴۳)

ترجمہ: "ایمان یمن کی طرف سے نکلا ہے اور کفر مشرق (پورب) کی طرف سے، سکون و اطمینان والی زندگی بکری والوں کی ہے اور فخر و ریاکاری فدادین یعنی گھوڑے اور اونٹ والوں میں ہے، جب مسیح دجال احد کے پیچھے آئے گا تو فرشتے اس کا رخ شام کی طرف پھیر دیں گے اور شام ہی میں وہ ہلاک ہو جائے گا۔"

⑫- مؤمنوں کا جائے قرار

ارضِ شام مؤمنوں کا جائے قرار ہوگا، سلمہ بن نفیل کندی رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:-

"ولا يزالُ من أمَّتي أمةٌ يقاتِلونَ على الحقِّ، ويزيغُ اللهُ لَهم قُلوبَ أقوامٍ، ويرزقُهم منْهم حتَّى تقومَ السَّاعةُ وحتَّى يأتِيَ وعدُ اللهِ والخيلُ معقودٌ في نواصيها الخيرُ إلى يومِ القيامَةِ، وَهوَ يوحي إليَّ أنِّي مقبوضٌ غيرُ ملبَّثٍ، وأنتم تتَّبعوني أفنادًا يضربُ بعضُكم رقابَ بعضٍ، وعقرُ دارِ المؤمنينَ الشَّامُ۔" (صحیح النسائی: ۳۵۶۳)

ترجمہ: "میری امت میں سے ایک جماعت حق کی خاطر ہمیشہ برسرِ پیکار رہے گی اور اللہ تعالیٰ کچھ قوموں کے دلوں کو ان کی خاطر کجی میں مبتلا رکھے گا اور انھیں (اہلِ حق کو) ان ہی (گمراہ لوگوں) کے ذریعہ روزی ملے گی۔ یہ سلسلہ قیامت تک چلتا رہے گا، جب تک اللہ کا وعدہ (متقیوں کے لیے جنت اور مشرکوں و کافروں کے لیے جہنم) پورا نہ ہو جائے گا، قیامت تک گھوڑوں کی پیشانیوں میں بھلائی (خیر) بندھی ہوئی ہے اور مجھے بذریعہ وحی یہ بات بتا دی گئی ہے کہ جلد ہی میرا انتقال ہو جائے گا اور تم لوگ مختلف گروہوں میں بٹ کر میری اتباع (کا دعویٰ) کرو گے اور حال یہ ہوگا کہ سب (اپنے متعلق حق پر ہونے کا دعویٰ کرنے کے باوجود) ایک دوسرے کی گردنیں کاٹ رہے ہوں گے اور مسلمانوں کے گھر کا آنگن شام ہو گا (جہاں وہ کشادگی سے رہ سکیں گے)۔"

⑬- خلافت کا قیام

قربِ قیامت ارضِ شام میں ہی خلافت کا قیام ہوگا، عبد اللہ بن حوالہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:-

"يا ابنَ حوالةَ، إذا رأيتَ الخلافةَ قد نزَلَت أرضَ المقدَّسةِ فقد دنَتِ الزَّلازِلُ والبَلابلُ والأمورُ العِظامُ، والسَّاعةُ يومَئذٍ أقربُ منَ النَّاسِ من يدي هذهِ من رأسِكَ۔" (صحیح أبی داود: ۲۵۳۵، وصحیح

الجامع: ۸۳۸۷)

"اے ابنِ حوالہ! جب تم دیکھو کہ خلافت ارضِ مقدس (شام) تک پہنچ گئی ہے تو زلزلے آنے لگیں گے، مصیبتیں ٹوٹیں گی اور بھی بڑی بڑی علامتیں ظاہر ہوں گی اور قیامت اس وقت لوگوں کے اس سے زیادہ قریب ہوگی جتنا کہ میرا ہاتھ تمہارے سر سے قریب ہے۔"

⑭- آخری پناہ گاہ

قربِ قیامت شام کی سرزمین ہی ایمان والوں کی آخری پناہ گاہ ہوگی، حضرت عبد اللہ بن عمرو رضی اللہ عنہما بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا:-

"ستخرجُ نارٌ من حضرموتَ أو من نحوِ بحرِ حضرموتَ قبلَ يومِ القيامةِ تحشُرُ النّاسَ قالوا: يا رسولَ اللهِ، فما تأمُرُنا؟ فقالَ: عليكُم بالشّامِ۔" (صحیح الترمذی: ۲۲۱۷)

ترجمہ: "قیامت سے پہلے حضر موت یا حضر موت کے سمندر کی طرف سے ایک آگ نکلے گی جو لوگوں کو اکٹھا کرے گی، صحابہ نے عرض کیا: اللہ کے رسول (ﷺ)! اس وقت آپ ہمیں کیا حکم دیتے ہیں؟ آپ ﷺ نے فرمایا: تم شام چلے جانا۔"

⑮- مسلمانوں کا مرکز

قربِ قیامت شام کا شہر دمشق مسلمانوں کا مرکز ہوگا۔ سیدنا ابو درداء رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:-

"إنّ فُسطاطَ المسلمين، يومَ الملحمةِ، بالغُوطةِ إلى جانبِ مدينةٍ يُقالُ لها: دمشقُ، من خيرِ مدائنِ الشّامِ۔" (صحیح أبي داود: ۴۲۹۸)

ترجمہ: "جنگ کے موقع پر مسلمانوں کا خیمہ (مرکز) دمشق نامی شہر کی جانب میں واقع مقام غوطہ ہوگا اور دمشق شام کے بہترین شہروں میں سے ہوگا۔"

⑯- مقامِ طائفہ منصورہ

سرزمینِ شام ہی وہ مقام ہوگا جہاں طائفہ منصورہ کا قیام ہوگا۔ حضرت زید بن ارقم رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا:-

"لا تزالُ طائفةٌ مِن أُمَّتي على الحقِّ ظاهرينَ، وإنِّي لأرجو أنْ تكونوهم يا أهلَ الشّامِ۔" (تخریج المسند لشعیب الأرناؤوط: ۱۹۲۹۰ باسناد صحیح)

ترجمہ: "میری امت کی ایک جماعت حق پر غالب رہے گی اور مجھے امید ہے کہ اے شام والو! تم اس جماعت میں سے ہوگے۔"

⑰- اللہ تعالیٰ کی خصوصی مدد

اہلِ شام کو اللہ تعالیٰ کی خصوصی مدد حاصل رہے گی، چنانچہ سیدنا معاویہ اپنے باپ سیدنا قرہ رضی اللہ عنہ سے روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:-

"إذا فسدَ أهْلُ الشّامِ فلا خيرَ فيكم: لا تزالُ طائفةٌ من أمَّتي منصورينَ لا يضرُّهم من خذلَهُم حتَّى تقومَ السّاعةُ۔" (صحیح الترمذی: ۲۱۹۲، والسلسلۃ الصحیحۃ: ۴۰۳)

ترجمہ: "جب اہلِ شام فساد کا شکار ہو جائیں تو پھر تم میں کوئی خیر نہیں۔ میری امت میں سے ایک طبقہ نصرت مند رہے گا، جو لوگ ان کو بے یار و مددگار چھوڑیں گے وہ ان کا کچھ نہ بگاڑ پائیں گے، یہاں تک کہ قیامت آ جائے۔"

⑱- اللہ تعالیٰ کی منتخب زمین اور منتخب بندے

شام اللہ تعالیٰ کی منتخب زمین اور وہاں اللہ کے منتخب بندے رہیں گے۔ سیدنا ابو امامہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا:-

"صَفوةُ اللهِ من أرضِه الشّامُ، وفيها صَفْوتُه من خلقِه وعبادِه، ولَيدْخُلَنَّ الجنةَ من أمَّتي ثُلَّةٌ لا حِسابَ عليهم ولا عذابَ۔" (صحیح الجامع: ۳۷۶۵، والسلسلۃ الصحیحۃ: ۱۹۰۹)

ترجمہ: "شام اللہ تعالیٰ کی منتخب سرزمین ہے، وہاں اللہ کی پسندیدہ مخلوق اور پسندیدہ بندے رہائش پذیر ہیں اور میری امت کی ایک جماعت جنت میں اس طرح داخل ہوگی کہ ان کا نہ حساب لیا جائے گا اور نہ ہی ان پر کسی قسم کا عذاب ہوگا۔"

منتخب سرزمین اور منتخب بندوں کا معنی

"کسی سرزمین کا اللہ تعالیٰ کے نزدیک منتخب ہونے کا معنی یہ ہے کہ وہاں اعمالِ خیر بکثرت ادا کیے جائیں گے اور بندوں کا اللہ کے نزدیک منتخب ہونے کا معنی یہ ہے کہ وہ لوگ اللہ کے طاعت شعار اور عبادت گزار بندے ہوں گے۔ نیز اس حدیث کے اسلوب سے یہ بھی پتا چلتا ہے یہ مبارک جماعت جس کا ذکر اس حدیث کے آخر میں کیا گیا ہے ان میں سے اکثر اہلِ شام یا شام کے باشندے ہوں گے۔" (التنویر شرح الجامع الصغیر: ۶/ ۵۸۴)

⑲- پانی صرف شام میں دستیاب ہوگا

آخری زمانے میں پانی صرف شام میں میسر ہوگا۔ سیدنا عبد اللہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا:-

"يُوشِكُ أن تطلبُوا في قُراكُم هذه طستًا من ماءٍ فلا تجدونَه، ينزوي كلُّ ماءٍ إلى عنصرِه؛ فيكونُ في الشّامِ بقيّةُ المؤمنين والماءِ۔" (السلسلۃ الصحیحۃ: ۳۰۷۸)

ترجمہ: "قریب ہے کہ تم ان بستیوں میں ایک پیالہ پانی کا تلاش کرو، لیکن کامیاب نہ ہوسکو۔ یعنی سارے کا سارا پانی اپنی اصل کی طرف سکڑ جائے گا اور باقی ماندہ مومن اور پانی شام میں ہوں گے۔"

⑳- صحابہ کرام رضی اللہ عنہم و اسلافِ امت کا مرکز

انبیاء کرام علیہم السلام کے بعد سرزمینِ شام اسلام کا مرکز و محور اور صحابہ کرام و اسلافِ امت کا مسکن رہی ہے، سیدنا معاویہ رضی اللہ عنہ کا ایک لمبے عرصے تک دار الخلافہ یہی سرزمین رہی! شیخ الاسلام ابن تیمیہ، شیخ الاسلام ابن قیم، حافظ ذہبی، حافظ ابن کثیر رحمۃ اللہ علیہم وغیرہم کثیرا کا تعلق بھی دمشق سے تھا۔

اسی سرسبز و شاداب سرزمین میں امام نووی شارحِ صحیح مسلم، شیخ الاسلام ابنِ تیمیہ، علامہ ابن القیم، حافظ ابنِ عساکر اور حافظ ابنِ حجر عسقلانی وغیرہم

جیسے علماء و فضلاء پیدا ہوئے۔ یہاں بہت سارے انبیاء، بہت سارے علماء و محدثین اور بہت سارے صحابہ کرام مدفون ہیں۔

(۲۱)-اقتصادی پابندی کی پیشین گوئی

ملکِ شام پر اہلِ روم کی طرف سے اقتصادی پابندیاں عائد کی جائیں گی۔ سیدنا ابونضرۃ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ ہم جابر بن عبد اللہ رضی اللہ عنہ کے پاس تھے کہ انھوں نے فرمایا:-

"يُوشِكُ أَهْلُ الْعِرَاقِ أَنْ لَا يُجْبَى إِلَيْهِمْ قَفِيزٌ وَلَا دِرْهَمٌ، قُلْنَا مِنْ أَيْنَ ذَلِكَ؟ قَالَ: مِنْ قِبَلِ الْعَجَمِ يَمْنَعُونَ ذَلِكَ، ثُمَّ قَالَ: يُوشِكُ أَهْلُ الشَّامِ أَنْ لَا يُجْبَى إِلَيْهِمْ دِينَارٌ وَلَا مُدْيٌ قُلْنَا مِنْ أَيْنَ ذَلِكَ؟ قَالَ: مِنْ قِبَلِ الرُّومِ۔" (صحیح مسلم: ۲۹۱۳)

"قریب ہے کہ اہلِ عراق کے لیے ان کا قفیز (پیمانہ) اور درہم (چاندی کی کرنسی) کوئی فائدہ نہ دے۔ ہم نے پوچھا: یہ کیسے ممکن ہوگا؟ تو انھوں نے جواب دیا کہ یہ غیر عرب (عجم) کی طرف سے ہوگا جو ان سب چیزوں کو روک دیں گے۔ پھر سیدنا جابر رضی اللہ عنہ نے فرمایا: قریب ہے کہ اہلِ شام کے لیے ان کا دینار (سونے کی کرنسی) اور مدی (پیمانہ) بھی کوئی فائدہ نہ دے۔ ہم نے پوچھا: ایسا کیسے ہوگا؟ تو سیدنا جابر رضی اللہ عنہ نے جواب دیا کہ یہ اہلِ روم کی طرف سے ہوگا۔"

(۲۲)- رحمت و فضل الٰہی کی ٹھنڈی ہوائیں

قربِ قیامت سرزمینِ شام سے ٹھنڈی ہوائیں چلیں گی جو اللہ تعالیٰ کی طرف سے اہلِ ایمان کے لیے رحمت و فضل کا باعث ہوں گی۔ عبد اللہ بن عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا:-

"يَخْرُجُ الدَّجَّالُ فِي أُمَّتِي فَيَمْكُثُ أَرْبَعِينَ — لَا أَدْرِي: أَرْبَعِينَ يَوْمًا، أَوْ أَرْبَعِينَ شَهْرًا، أَوْ أَرْبَعِينَ عَامًا فَيَبْعَثُ اللهُ عِيسَى ابْنَ مَرْيَمَ كَأَنَّهُ عُرْوَةُ بْنُ مَسْعُودٍ، فَيَطْلُبُهُ فَيُهْلِكُهُ، ثُمَّ يَمْكُثُ النَّاسُ سَبْعَ سِنِينَ، لَيْسَ بَيْنَ اثْنَيْنِ عَدَاوَةٌ، ثُمَّ يُرْسِلُ اللهُ رِيحًا بَارِدَةً مِنْ قِبَلِ الشَّامِ، فَلَا يَبْقَى عَلَى وَجْهِ الْأَرْضِ أَحَدٌ فِي قَلْبِهِ مِثْقَالُ ذَرَّةٍ مِنْ خَيْرٍ أَوْ إِيمَانٍ إِلَّا قَبَضَتْهُ، حَتَّى لَوْ أَنَّ أَحَدَكُمْ دَخَلَ فِي كَبِدِ جَبَلٍ لَدَخَلَتْهُ عَلَيْهِ، حَتَّى تقبِضَه۔" (صحیح مسلم: ۲۹۴۰)

ترجمہ: "دجال میری امت میں چالیس تک رہے گا۔ مجھے نہیں معلوم کہ چالیس سے مراد چالیس دن یا چالیس مہینے یا چالیس سال ہیں۔ پھر اللہ تعالیٰ عیسیٰ بن مریم علیہما السلام کو بھیجیں گے جو عروہ بن مسعود سے مشابہ ہوں گے۔ پس وہ دجال کو تلاش کریں گے اور اسے قتل کریں گے۔ پھر لوگ سات سال تک اس حال میں رہیں گے کہ دو آدمیوں کے مابین بھی دشمنی نہ ہوگی۔ پھر اللہ تعالیٰ شام کی طرف سے ایک ٹھنڈی ہوا بھیجیں گے اور دنیا میں کوئی بھی ایسا شخص باقی نہ رہے گا کہ جس کے دل میں ذرہ برابر بھی ایمان یا خیر ہو چاہے وہ پہاڑ کی کھوہ میں ہی داخل کیوں نہ ہو جائے وہاں بھی وہ ہوا گھس کر اس کی روح قبض کر لے گی۔"

یعنی قیامت کی سختیاں شروع ہونے سے پہلے ہی اللہ تعالیٰ اپنے نیک بندوں کو اٹھا لیں گے۔

(۲۳)- سرزمینِ شام کا نورانی نظارہ

سرزمینِ شام وہ پاکیزہ سرزمین ہے جسے رسول اللہ ﷺ کی ولادت کے وقت ہی آپ ﷺ کی والدہ ماجدہ کو اس کی زیارت کرائی گئی، چنانچہ حضرت ابو امامہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں:-

"يا نَبِيَّ اللهِ، ما كان أَوَّلُ بدءِ أَمْرِكَ؟ قال: دَعْوةُ أبي إبراهيمَ، وبُشرى عيسى، ورَأَتْ أُمِّي أنَّه يَخرُجُ منها نورٌ أضاءَتْ منه قُصورُ الشَّامِ۔" (تخریج المسند لشعیب الارناؤوط: ۲۲۲۶۱، باسناد صحیح، وصححہ الحاکم: ۳۵۶۶، و ابن حبان: ۶۴۰۴، والالبانی فی السلسلۃ الصحیحۃ: ۱۹۲۵،۳۸۳)

"میں نے رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں عرض کیا: یا رسول اللہ (ﷺ)! آپ کی نبوتِ مبارکہ کی شروعات کیسے ہوئی؟ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: میں اپنے باپ ابراہیم علیہ السلام کی دعا اور عیسیٰ علیہ السلام کی بشارت ہوں۔ اور (میری ولادت کے وقت) میری والدہ ماجدہ نے دیکھا کہ اُن کے جسمِ اَطہر سے ایک نور نکلا جس سے شام کے محلات روشن ہو گئے۔"

نبی اکرم ﷺ کی ولادت کے وقت شام کا یہ نورانی مظاہرہ اس بات کی دلیل ہے کہ سرزمینِ شام ایک مقدس مقام ہے اور یہ ایک روحانی اور دینی مرکز ہے۔

امام ابنِ کثیر رحمہ اللہ اس کی شرح میں فرماتے ہیں:-

"وتخصيص الشام بظهور نوره : إشارة إلى استقرار دينه، ونبوته ببلاد الشام . ولهذا تكون الشام في آخر الزمان معقلاً للإسلام وأهله، وبها ينزل عيسى ابن مريم۔" (تفسیر ابن کثیر: ۱/۴۴۴)

ترجمہ: "شام کو نور کے ظہور کے لیے خاص کرنے کا مطلب یہ ہے کہ اس سرزمین پر اللہ کے دین اور اس کی نبوت کو مضبوطی حاصل ہوگی۔"

یہی وجہ ہے کہ آخری زمانے میں شام اسلام اور مسلمانوں کے لیے ایک محفوظ پناہ گاہ بنے گا اور یہی وہ مقدس مقام ہوگا جہاں عیسیٰ ابن مریم علیہ السلام نازل ہوں گے۔

(۲۴)- یاجوج و ماجوج کی جائے قتل

قیامت سے پہلے سرزمینِ شام یاجوج و ماجوج کی قتل گاہ بن جائے گی۔ سیدنا عبد اللہ بن عمر رضی اللہ عنہما بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا:-

"ثُمَّ يَسِيرُونَ حَتَّى يَنْتَهُوا إِلَى جَبَلِ الْخَمَرِ، وَهُوَ جَبَلُ بَيْتِ الْمَقْدِسِ، فَيَقُولُونَ : لَقَدْ قَتَلْنَا مَنْ فِي الْأَرْضِ هَلُمَّ فَلْنَقْتُلْ مَنْ فِي السَّمَاءِ، فَيَرْمُونَ بِنُشَّابِهِمْ إِلَى السَّمَاءِ، فَيَرُدُّ اللهُ عَلَيْهِمْ نُشَّابَهُمْ مَخْضُوبَةً دَمًا۔" (صحیح مسلم: ۲۹۳۷)

بقیہ صفحہ ۱۱ پر ملاحظہ کریں

محمد تنزیل الصدیقی الحسینی

امن میں جنگ کی تیاری
دشمن کے خلاف قوم کی مکمل بیداری

جو قوم دشمنوں کے نرغے میں ہو اور اس کے دشمن بھی کمینہ خصلت، کینہ توز اور اخلاق سے عاری ہوں، اس قوم کو ہمہ وقت بیدار رہنے کی ضرورت ہے۔ آپریشن بنیان مرصوص کے بعد الحمد للہ پاکستان کا وقار دنیا بھر میں بلند ہوا اور قوم میں انتشار کی جگہ یکجہتی کے جذبات پروان چڑھے ہیں؛ جو یقینی طور پر خوش آئند امر ہے۔ تاہم بحیثیت قوم اگر ہم چاہتے ہیں کہ اس کامیابی کے ثمرات دیرپا ہوں اور یہ کامیابی ہمارے لیے مستقبل کے روشن امکانات کے در وا کر دے تو ضروری ہے کہ قوم بیدار رہے اور ہمیشہ بیدار رہے۔ دشمن پر بھی نظر رکھے اور غدارانِ وطن کا بھی قلع قمع کرے۔

فکری و جذباتی بیداری

بعض افراد جنگ کو گفتگو کا ایک دلچسپ موضوع یا تصوراتی فلمی خیال سمجھتے ہیں، حالانکہ جنگ موت، بھوک، خوف اور تباہی کا دوسرا نام ہے۔ سچ یہ ہے کہ جنگ میں اسکول بند ہوتے ہیں، اسپتال زخمیوں سے بھر جاتے ہیں، گھر کھنڈر بن جاتے ہیں، کاروبارِ زندگی مفلوج ہو جاتی ہے، آرزوئیں ناتکمیل رہ جاتی ہیں اور خوشیاں خام ہو جاتی ہیں۔ مثال کے طور پر:-

❁ - شام جیسا دنیا کا خوبصورت ملک صرف ۵ سال میں کھنڈر بن گیا۔

❁ - تیل سے مالا مال ملک عراق آج پانی و دوا کو ترس رہا ہے۔

❁ - تعلیم یافتہ اور معدنی ذخائر کا حامل یورپی ملک یوکرین میں چند ہفتوں میں لاکھوں افراد بے گھر ہو گئے۔

دشمن کی چالیں صرف اسلحے اور ہتھیاروں سے ہی نہیں ہوتیں، دماغ سے بھی ہوتی ہیں۔ دشمن آپ کے سوشل میڈیا، ذرائع ابلاغ اور اذہان کو پہلے ہدف بناتا ہے۔ جو قوم متحد نہ ہو، یا جو جنگ کو ہنسی مذاق سمجھے، وہ شکست کے دہانے پر کھڑی ہوتی ہے۔ اس لیے اس حوالے سے قوم کی فکری و جذباتی بیداری ضروری ہے۔

شہری دفاعی تربیت

امکانِ جنگ کے موقع پر قوم کی دفاعی تربیت ضروری ہے۔ جیسے:-

❁ - ابتدائی طبی امداد (First Aid) ہر شہری کو درج ذیل چیزوں کی تربیت ہونی چاہیے: زخم پر پٹی باندھنا، زخموں سے خون روکنا، جلنے کی صورت میں ابتدائی علاج، زخمی کو محفوظ جگہ منتقل کرنا۔

❁ - آگ بجھانے اور دھواں سے بچاؤ: آگ لگنے کی صورت میں کیا کریں؟ پانی، ریت یا فائر ایکسٹنگوشر (Fire Extinguisher) کا استعمال آنا چاہیے۔ بچوں، بوڑھوں اور عورتوں کو ایسے مقام سے بحفاظت نکالنے کا طریقہ معلوم ہونا چاہیے۔

❁ - حملے کی صورت میں کیسا رویہ اختیار کریں؟ اگر فضائی حملہ ہو جائے تو پناہ گاہ یا بنکر میں چلے جائیں، اگر پناہ گاہیں نہیں بنائی گئی ہیں تو مناسب ہے کہ حکومت کی مدد یا اپنی مدد آپ کے تحت ہر علاقے میں ایسی پناہ گاہیں بنائی جائیں۔ ورنہ بوقت حملہ زمین پر لیٹ جائیں، کھڑکیوں سے دور رہیں۔

پناہ گاہوں یا بنکروں کی اہمیت کا اندازہ موجودہ دور کی جنگوں کی کیفیت سے لگایا جا سکتا ہے۔ ایران کی جانب سے جون ۲۰۲۵ء میں ہونے والے فضائی حملوں میں اسرائیل کا جانی نقصان بہت کم ہوا کیوں کہ انھوں نے جنگی حالات کی تیاری کرتے ہوئے ہر علاقے میں بنکر اور زیر زمین محفوظ پناہ گاہیں بنا رکھی ہیں۔ اس کے برعکس اسرائیل کے ایران پر حملے کی صورت میں کافی جانی نقصان ہوا۔

پاکستان میں جہاں گنجان آبادی ہے ایسے بنکر یا پناہ گاہیں موجود نہیں؛ فوری طور پر ان کا بنانا تو آسان نہیں تاہم بحیثیت قوم اس حوالے سے کوشش ضرور کی جانی چاہیے تاکہ کسی حملے کی صورت میں کم سے کم جانی نقصان ہو۔

❁ - اگر زمینی حملہ ہو تو بچوں، بوڑھوں اور عورتوں کے لیے علاقہ چھوڑنے کا منصوبہ پہلے سے تیار رکھیں۔ جو مرد اعصابی اعتبار سے مضبوط اور لڑنے کا تجربہ و ہمت رکھتے ہوں وہ اپنی فوج کا ساتھ دیں اور ان کی رہ نمائی میں جنگ میں حصہ لیں۔

معلوماتی، مواصلاتی اور سائبر دفاع

جنگ کے دوران خبروں کی بے حد اہمیت ہے محض ایک خبر حوصلہ توڑ بھی سکتی ہے اور دم توڑتی سانسوں میں زندگی بھی پیدا کر سکتی ہے۔ اس لیے:-

❁ - دشمن کا سب سے خطرناک ہتھیار افواہیں ہیں جسے پھیلا کر وہ قوم کو توڑنے کی کوشش کرتا ہے۔

اس لیے ہر خبر کی صرف مستند و معتبر ذرائع سے تصدیق کریں۔

❁ - سوشل میڈیا کا ذمہ دارانہ استعمال کیجیے۔ اپنی فوج کی نقل وحرکت، سیکیورٹی تفصیلات، یا ویڈیوز ہرگز شیئر نہ کریں۔جنگی حالات میں سوشل میڈیا پر غیر ضروری مواد بالکل نہ ڈالیں بلکہ قوم کا مورال بلند رکھنے کی ہر ممکن کوشش کریں۔

❁ - سائبر حملوں سے بچاؤ بھی ضروری ہے اس لیے اپنے موبائل، کمپیوٹر اور لیپ ٹاپ کو محفوظ رکھیں۔ مشکوک لنکس اور کالز سے بچیں۔ کسی انجانے لنک پر کلک نہ کریں اور نہ ہی کسی مشکوک کال کو ریسیو کیجیے۔

مقامی دفاعی نظام کی تشکیل

ضروری ہے کہ علاقائی سطح پر ایک مکمل دفاعی نظام تشکیل دیا جائے۔

❁ - یعنی محلہ وار ٹیمیں تیار کی جائیں۔ ہر گلی، کالونی یا گاؤں میں رضا کاروں پر مشتمل ٹیم تیار ہو جنھیں اپنی اپنی ذمہ داریوں کا علم ہو جیسے: طبی امداد دینے والے، آگ بجھانے والے، خواتین اور بچوں کی حفاظت کرنے والے، بوڑھوں کا خیال رکھنے والے۔ جامع مساجد یا یونین کونسل ان رضا کاروں کے دفتر کے طور پر استعمال کیے جاسکتے ہیں۔

❁ - مقامی سطح پر قبل از وقت منصوبہ بندی بھی ضروری ہے۔ مثلاً اگر حملہ ہو جائے تو لوگ کہاں جمع ہوں؟ بیماروں کو کون سنبھالے گا؟ کھانے پینے کا بندوبست کہاں سے ہوگا؟ لوگوں کو نظم و نسق میں رکھنا ضروری ہے۔

بنیادی ضروریات کا سادہ ذخیرہ

ایسے حالات میں جب بازار بند ہوں، یا رسد منقطع ہو جائے تو کم از کم ۱۵ دن کا ذخیرہ ہر گھر میں موجود ہونا چاہیے۔

❁ - اس کے لیے ضروری اشیاء کی فہرست (گھرانے کے افراد کے مطابق) پیش خدمت ہے:-

اشیاء	مقدار (فی فرد، ۱۵ دن کے لیے)
آٹا/ چاول	۵-۷ کلو
دالیں	۱-۲ کلو
گھی/ تیل	۱ لیٹر
نمک/ چینی	۱/ ۱ کلو
پینے کا صاف پانی	۱۰ سے ۱۵ لیٹر
خشک یا پیک دودھ	۱-۲ لیٹر
ماچس/ لائٹر	۲-۳ عدد
ٹارچ/ بیٹری	ہر فرد کے لیے ایک
دوا	بخار، درد، الرجی، وغیرہ کا مکمل ایک پیک تیار ہو۔

مستقل مریض اپنی بیماری کی نوعیت کے اعتبار سے اپنی دواؤں کا مناسب ذخیرہ ضرور رکھیں۔

❁ - ذخیرہ اندوزی اور ذخیرہ شعوری میں واضح فرق ہے۔ ذخیرہ زندگی بچانے کے لیے کیا جاتا ہے، نہ کہ بازار سے اشیاء غائب کرنے کے لیے۔ غیر ضروری مقدار، یا دوسروں کے حصے کا ذخیرہ حرام ہوسکتا ہے۔ اسی طرح ایسی اشیاء جنھیں زیادہ دنوں تک بحفاظت نہیں رکھا جا سکتا ان کی بڑی تعداد میں ذخیرہ اندوزی بھی درست نہیں۔ یاد رکھیے اشیاء کا تلف کرنا بھی اس وقت کے حالات میں ایک قومی جرم ہے۔

خواتین، بچوں اور بزرگوں کے لیے کچھ اہم اور مخصوص ہدایات

خواتین ابتدائی طبی امداد سیکھیں، پرس میں بنیادی دوا، شناختی کارڈ، رابطہ نمبرز رکھیں۔ بچوں کو تیار رکھنے کی عادت ڈالیں۔ چوکنا رہیں اور اپنے مردوں کا حوصلہ بڑھائیں۔

بچے والدین کی ہدایات پر مکمل عمل کریں، ان کی اجازت کے بغیر کہیں نہ جائیں۔ اسکولوں میں جنگی احتیاطی ڈرلز کروائی جائیں۔

بزرگوں کے ساتھ رابطہ رکھنے کا متبادل طریقہ طے کریں (جیسے پڑوسی یا رشتہ دار کے توسط سے)، ان کے لیے الگ دوا، چشمہ، واکنگ اسٹک وغیرہ ایک بیگ میں تیار رکھیں۔

روحانی و اخلاقی تربیت

سب سے اہم بات یہ کہ قوم کا روحانی و اخلاقی نظام درست ہونا ضروری ہے۔ ایک منتشر اور انارکیت زدہ قوم کبھی کسی میدان میں کامیاب نہیں ہوسکتی۔ ضروری ہے کہ پوری قوم ایسے وقت میں ایک خاندان بن جائے۔ ہر کوئی دوسرے کا درد اپنے سینے میں محسوس کرے۔ پانے سے زیادہ دینے کی خواہش ہو۔ ایثار و قربانی کو شعار بنایا جائے۔ اتحاد کو مضبوط رکھا جائے۔

وَاسْتَعِينُوا بِالصَّبْرِ وَالصَّلَاةِ ۚ (البقرۃ: ۴۵) کے حکم قرآنی سے اپنی زندگیوں کو آراستہ کیا جائے۔ صبر، دعاء، اور اذکار کا بھرپور اہتمام، صبح و شام آیۃ الکرسی، معوذتین پڑھنے کی تلقین، حالتِ جنگ میں بھی نماز قائم رکھنے کی مکمل کوشش؛ یہ وہ امور ہیں جو روحانی طاقت کے حصول کا ذریعہ ہیں جس سے اللہ پر توکل اور غیر معمولی تعلق استوار ہوتا ہے جو خوف کو کم کرتا اور ہمت کو بڑھاتا ہے۔

اس موقع پر سیرت نبوی ﷺ سے سبق لینے کی بھی ضرورت ہے۔ مثال کے طور پر:-

❁ - جنگ بدر میں کم وسائل کے باوجود کامل اتحاد اور ایمانی طاقت سے اپنے سے تین گنا بڑے دشمن کو شکست فاش دی۔

❁ - غزوہ احد سے ہمیں سبق ملتا ہے احکام کی پابندی ضروری ہے۔ نظم و نسق کے بغیر کوئی فتح ممکن نہیں۔

❁ - غزوہ خندق کے موقع پر کس طرح ریاست مدینہ کے ہر خاص و عام شہری نے مل کر دفاع کو مضبوط بنانے کے لیے عملی جدوجہد کی۔

❁ -صلح حدیبیہ؛ تدبیر، برداشت، اور حکمت کا شاہکار ہے۔

پاک بھارت جنگ کے امکانات

برصغیر کی دو بڑی ایٹمی طاقتیں پاکستان اور بھارت؛ آزادی کے بعد سے اب تک کئی بار جنگی تصادم کا شکار ہو چکی ہیں۔ ۱۹۴۷ء، ۱۹۶۵ء، ۱۹۷۱ء،

۱۹۹۹ء اور ۲۰۲۵ء کی تازہ جنگی جھڑپیں اس تلخ تاریخ کی نمایاں مثالیں ہیں۔ لیکن چوں کہ یہ دونوں ممالک جوہری طاقت بن چکے ہیں، اس لیے کسی ممکنہ جنگ کی نوعیت نہ صرف مقامی بلکہ عالمی تباہی کا پیش خیمہ بھی بن سکتی ہے۔

حال ہی میں ہونے والے سفارتی تناؤ، لائن آف کنٹرول (LOC) پر جھڑپیں، اور بھارت میں بڑھتی ہوئی ہندوتوا پالیسیوں نے تعلقات کو مزید پیچیدہ بنا دیا ہے۔ بی جے پی حکومت کی جانب سے پاکستان مخالف بیانیہ ایک سیاسی حربے کے طور پر استعمال ہوتا رہا ہے، جس کا اثر عوامی سطح پر بھی شدت سے محسوس کیا جا سکتا ہے۔

مئی ۲۰۲۵ء میں بھارت کی جانب سے آپریشن سیندور اور اس کے جواب میں آپریشن بنیان مرصوص نے پاک بھارت تعلقات کو کشیدگی کی انتہا پر پہنچا دیا ہے اور جنگ کے امکانات کو تازہ کر دیا ہے۔ گو کہ پاکستان کا ردعمل حکیمانہ اور بردبار رہا ہے مگر بھارت کا جنگی جنون خطے کے امن کے لیے ایک مستقل خطرہ بن گیا ہے۔

جنگ کی صورت میں نہ صرف انسانی جانیں ضائع ہوں گی بلکہ دونوں ممالک کی معیشتیں دہائیوں پیچھے چلی جائیں گی۔ تعلیم، صحت، روزگار اور ترقیاتی منصوبے مکمل طور پر مفلوج ہو جائیں گے۔ دونوں ممالک کی عوام پہلے ہی مہنگائی، بے روزگاری اور معاشی دباؤ کا شکار ہیں؛ جنگ ان زخموں کو ناسور بنا دے گی۔

دونوں ممالک کے پاس ایٹمی ہتھیار موجود ہیں، اور ان کے استعمال کی صورت میں نہ صرف کروڑوں جانیں خطرے میں پڑ سکتی ہیں بلکہ ماحولیاتی تباہی بھی پوری دنیا کو اپنی لپیٹ میں لے سکتی ہے۔ اس کی وجہ سے نہ صرف جنوبی ایشیا بلکہ دنیا بھر میں شدید موسمی تبدیلیاں اور قحط کی کیفیت پیدا ہو سکتی ہے۔

اگرچہ بین الاقوامی سطح پر دونوں ممالک کو امن کی راہ پر لانے کی متعدد کوششیں ہوئی ہیں، مگر یہ ہمیشہ محدود، وقتی اور غیر مؤثر ثابت ہوئی ہیں۔ شنگھائی تعاون تنظیم (SCO)، او آئی سی اور اقوام متحدہ جیسے پلیٹ فارمز پر سفارتی سطح پر مکالمہ کبھی مکمل کامیابی حاصل نہیں کر سکا۔

پاک بھارت کشمکش کی تاریخ اس پر شاہد ہے کہ ہمارا دشمن اتنا کینہ توز اور کمینہ خصلت ہے جس نے ہمیشہ رات کی تاریکی میں اچانک حملہ کیا اور عام شہریوں کی جانوں کو نقصان پہنچانے سے بھی گریز نہیں کیا۔ موجودہ حالات میں جب کی پاک بھارت کشیدگی عروج پر ہے۔ بھارت میں جنگی جنون میں مبتلا ہندتوا فلسفہ اس وقت اقتدار پر قابض ہے۔ آپریشن بنیان مرصوص کے بعد بھارت کی جو عالمی جگ ہسائی ہوئی ہے اس کے بعد ہم جنگ کے امکانات کو یکسر مسترد نہیں کر سکتے۔

موجودہ صورت حال

تازہ ترین صورت حال یہ ہے کہ پاکستان کے براہ راست دشمن کی فہرست صرف بھارت تک محدود نہیں رہی۔ کیوں کہ آپریشن سیندور میں بھارت کے ساتھ اسرائیل بھی براہ راست پاکستان پر حملے میں ملوث تھا؛ اس سے قبل بھی پاکستان کے خلاف خفیہ سازشوں میں اسرائیل کی بھارت کے ساتھ مکمل شراکت رہی ہے۔ گویا پاکستان کو اس وقت دو بڑے دشمنوں کا سامنا ہے؛ بھارت اور اسرائیل۔ اور جب اسرائیل کہا جاتا ہے تو اس میں امریکا خود بخود شامل ہو جاتا ہے کیوں کہ یہ دونوں لازم وملزوم ہیں۔

پاکستان کی مشرقی و مغربی دونوں سرحدوں پر جنگ کے بادل منڈلا رہے ہیں۔ ایران اور اسرائیل تنازع؛ بڑی عالمی طاقتوں کا مرکز توجہ بنا ہوا ہے۔ جو اگر مذاکرات کے ذریعے جلد حل نہ ہوا تو خطے میں بڑی کشیدگی کا سبب بن سکتا اس صورت میں یعنی اگر یہ تنازع بڑھتا ہے تو تیسری عالمی جنگ کے امکانات بھی روشن ہیں۔

حرفِ آخر

جنگ کبھی بھی مسائل کا حل نہیں ہوتی؛ جنگ تو خود ہی ایک مسئلہ ہے۔ بالخصوص ایٹمی جنگ نہ جیتی جا سکتی ہے، نہ اس میں کوئی فاتح ہوتا ہے۔ ایٹمی جنگ صرف میدان جنگ میں نہیں لڑی جاتی، بلکہ زمین کے ساتھ ساتھ فضا کو بھی اپنی لپیٹ میں لے لیتی ہے۔ یہ صرف آج پر اثر انداز نہیں ہوتی بلکہ آنے والی کئی نسلیں بھی اس سے متاثر ہوتی ہیں۔ گویا یہ صرف اور صرف انسانیت کا خاتمہ ہے۔ اس لیے احتیاط، حکمت، تدبیر اور امن کی راہ ہی اصل جنگی تیاری ہے۔ تاہم کبھی صورت حال ایسی بھی ہو جاتی ہے کہ جب جنگ ناگزیر ہو جاتی ہے، نہ چاہتے ہوئے بھی جنگ ہی واحد راہ رہ جاتی ہے:-

وَعَسٰٓى اَنْ تَكْرَهُوْا شَيْـًٔا وَّهُوَ خَيْرٌ لَّكُمْ ۚ وَعَسٰٓى اَنْ تُحِبُّوْا شَيْـًٔا وَّهُوَ شَرٌّ لَّكُمْ ۗ وَاللّٰهُ يَعْلَمُ وَاَنْتُمْ لَا تَعْلَمُوْنَ (البقرۃ: ۲۱۶)

"اور ممکن ہے تم کسی چیز کو ناگوار سمجھو اور وہ تمہارے لیے بہتر ہو، اور ممکن ہے کہ تم کسی چیز کو پسند کرو اور وہ تمہارے لیے مضر ہو، اور اللہ ہی جانتا ہے اور تم نہیں جانتے۔"

اسلام ہمیں بلاوجہ جنگ کرنے کا حکم نہیں دیتا بلکہ اس سے روکتا ہے لیکن اگر دشمن جنگ کرنے پر تلا ہو تو ہمیں بزدلی دکھانے سے بھی منع کیا گیا۔ اس موقع پر اسلام ہمیں نہ صرف مضبوط دفاع کرنے کا حکم دیتا ہے بلکہ اس وقت تک لڑنے کا حکم دیتا ہے جب تک کہ فتنہ و فساد ختم نہ ہو جائیں۔ اس لیے ضروری ہے کہ قوم کا ہر فرد عمومی نظم سے واقف ہو۔ گلی محلے کی سول ڈیفنس ٹیمیں فعال ہوں۔ افواہوں سے پاک ماحول ہو۔ دینی و روحانی تربیت روزمرہ کا حصہ ہو۔

یہ گائیڈ صرف تحریر نہیں، اقدام کا پہلا قدم ہے۔ اگر قوم میں شعور بیدار ہو جائے تو دشمن میدان میں آنے سے پہلے ہی شکست کھا جائے گا۔

❀ ❀ ❀ ❀ ❀

طبل جنگ

ابو عمار سلیم

آج ۹ مئی ۲۰۲۵ء کا دن ہے۔ پاکستان ہندوستان کے درمیان جنگ کی کشمکش کا تیسرا دن ہے۔ ان تین دنوں میں اس تنازعہ نے کیا رنگ اختیار کیا اور اور اس سے کیا نقصانات ہوئے اس کے بارے میں ابھی نہ تو مصدقہ اطلاعات ملی ہیں اور نہ ہی اس مضمون کا مقصد ان نقصانات پر کسی قسم کا تبصرہ کرنا ہے۔ سچ تو یہ ہے کہ آج کل جنگ کے معاملات میں کوئی بھی بات حتمی طور پر کہی نہیں جا سکتی۔ میڈیا کی جنگ عروج پر ہے کہ صحیح اور غلط اس طرح خلط ملط ہو جاتے ہیں کہ اصل صورت حال تک نظر ہی نہیں جاتی۔ دشمن بھی اتنا مصروف عمل ہے کہ ہماری صفوں میں گھس کر اس طرح کی خبریں پھیلا دیتا ہے کہ عوام اس خبر کے زیر اثر آ کر ان کو قبول کرنے کے بعد دشمن کے الفاظ کو ہی شد و مد سے دہرانے لگ جاتی ہے جس سے صورت حال مزید بگڑ جاتی ہے اور سچ جھوٹ کے گرد و غبار میں چھپ جاتا ہے۔ ان پچھلے تین دنوں میں جو کچھ بھی ہوا اس کی تفصیل تو بے یقینی کی گرد بیٹھنے کے کچھ عرصہ بعد آئے گی مگر فی الوقت ہم اس جنگی جنون اور اس کے مضمرات پر قرآن کریم اور اسلامی تاریخ کے حوالے سے کچھ گفتگو کرنا چاہتے ہیں۔

اولین بات یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں پر جہاد کو فرض کر دیا ہے سورۃ البقرۃ میں حکم دیا:-

وَقَاتِلُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَاعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰهَ سَمِيْعٌ عَلِيْمٌ (البقرۃ: ۲۴۴)

اور اللہ کی راہ میں لڑو اور سمجھ لو کہ بے شک اللہ خوب سننے والا جاننے والا ہے۔

بطور مسلمان ہم سب جانتے ہیں کہ جنگ کی آرزو کرنا یا جان بوجھ کر بلا اشتعال جنگ کا آغاز کرنا منع ہے۔ مگر جب جنگ سر پر مسلط کر دی جائے تو پھر اس سے منہ موڑنا اور پیٹھ پھیرنا قابل گرفت عمل ہے۔ اس موقع پر انتہائی ثابت قدمی سے دشمن کا سامنا کرنے کا حکم بھی ہے اور دشمن کے ساتھ سختی سے پیش آنے کی تلقین بھی۔ سورۃ التوبۃ میں ارشاد فرمایا:-

يٰٓاَيُّهَا النَّبِيُّ جَاهِدِ الْكُفَّارَ وَالْمُنٰفِقِيْنَ وَاغْلُظْ عَلَيْهِمْ ۭ وَمَاْوٰىهُمْ جَهَنَّمُ ۭ وَبِئْسَ الْمَصِيْرُ (التوبۃ: ۷۳)

اے پیغمبر! کافروں اور منافقین سے جہاد جاری رکھیں اور ان پر سختی کریں اور ان کا ٹھکانہ دوزخ ہے اور وہ بہت بری جگہ ہے۔

یہاں یہ بات جان لینی چاہیے کہ موجودہ صورت حال میں ہندوستان نے بلا اشتعال ہم پر حملہ کر دیا۔ پہلے پہلگام کشمیر میں خود دہشت گردی کی پھر اس کا الزام پاکستان پر لگا کر ہماری مساجد کو میزائلوں کا نشانہ بنایا۔ اب جنگ جب ہمارے سروں پر تھوپ دی گئی ہے تو بطور مسلمان ہم پیچھے تو ہٹ نہیں سکتے تھے۔ ہمارے مجاہدوں نے اللہ کے حکم کے عین مطابق اپنا کردار ادا کیا اور دشمن کو منہ توڑ جواب دیا۔ ہماری فوج کی تمام کارروائی اللہ کے حکم کے عین مطابق تھی اور جیسا کہ جہاد کو اس وقت تک جاری رکھنا ضروری تھا جب تک کہ فتنہ مٹ نہ جائے۔ سورۃ البقرۃ کی آیت ۱۹۳ کے حکم کے مطابق:-

وَقٰتِلُوْهُمْ حَتّٰى لَا تَكُوْنَ فِتْنَةٌ وَّيَكُوْنَ الدِّيْنُ لِلّٰهِ ۭ

''اور ان سے اس وقت تک لڑتے رہو یہاں تک کہ فساد مٹ جائے اور اللہ کا دین غالب آ جائے۔''

اس ہدف کو حاصل کرنے کے لیے اللہ کی طرف سے یہ ہدایت بھی جاری کی گئی کہ دشمنوں کو انتہائی دباؤ میں رکھو۔ سورۃ التوبۃ میں ارشاد فرمایا:-

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا قَاتِلُوا الَّذِيْنَ يَلُوْنَكُمْ مِّنَ الْكُفَّارِ وَلْيَجِدُوْا فِيْكُمْ غِلْظَةً ۭ (التوبۃ: ۱۲۳)

''اے ایمان والو! اپنے نزدیک کے کافروں سے جنگ کرو اور چاہیے کہ وہ تم میں (محنت اور جنگی صلاحیتوں میں) سختی پائیں۔''

یہ ایک ایسا حکم ہے کہ نہ صرف جنگ کے دوران اس کا اطلاق ہوتا ہے بلکہ جنگ سے بہت پہلے سامان جنگ کی تیاری اور حربی صلاحیتوں میں اضافہ کی کوششوں کو بھی اشارہ مل رہا ہے۔

اور پھر دوران جنگ کی ہدایات میں قرآن کریم میں سورۃ آل عمران کی آخری آیت میں اللہ تعالیٰ نے اس طرح ارشاد فرمایا:-

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اصْبِرُوْا وَصَابِرُوْا وَرَابِطُوْا ۣ وَاتَّقُوا اللّٰهَ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْنَ (آل عمران: ۲۰۰)

''اے ایمان والو! صبر کرو اور صبر میں اپنے دشمنوں سے بڑھ جاؤ اور مربوط رہو (مورچوں میں ڈٹے رہو) اور اللہ کا تقویٰ اختیار کیے رکھو تاکہ تم فلاح پاؤ۔''

اس آیت کریمہ میں تمام مسلمانوں کے لیے نہ صرف یہ کہ انتہائی صبر اور برداشت کرنے کی ہدایت ہے بلکہ جنگ کی صورت میں مسلمانوں کے افعال اور اعمال کی رہنمائی کر رہی ہے۔ یعنی جنگ مسلط ہو گئی تو اب اس صورت حال میں نہ تو گھبرانے کا اور نہ ہمت

ہارنے کا کوئی راستہ ہے۔ بلکہ اپنی بقا اور فلاح کا راستہ صرف استقامت اور انتہائی صبر اور سمجھداری سے عمل کرنے میں ہے۔ دشمن کے خلاف فتح کا ایک بڑا واضح راستہ قرآن کریم نے یہ بتایا ہے کہ جنگ سے بہت پہلے اپنے آپ کو جنگ کے لیے تیار کرلو۔ سورۃ الانفال میں فرمایا:-

وَاَعِدُّوْا لَهُمْ مَّا اسْتَطَعْتُمْ مِّنْ قُوَّةٍ وَّمِنْ رِّبَاطِ الْخَيْلِ تُرْهِبُوْنَ بِهٖ عَدُوَّ اللّٰهِ وَعَدُوَّكُمْ وَاٰخَرِيْنَ مِنْ دُوْنِهِمْ ۚ لَا تَعْلَمُوْنَهُمْ ۚ اَللّٰهُ يَعْلَمُهُمْ ۭ (الانفال: ۶۰)

''اور جہاں تک ہوسکے اپنی بھرپور قوت سے اور گھوڑوں کو تیار رکھنے سے ان کے مقابلہ کے لیے تیار رہو تاکہ اس سے اللہ اور تمہارے دشمنوں پر اور ان کے سوا دوسروں پر رعب پڑے، جنھیں تم نہیں جانتے اللہ انھیں جانتا ہے، اور اللہ کی راہ میں جو کچھ تم خرچ کرو گے تمہیں (اس کا ثواب) پورا ملے گا اور تم سے بے انصافی نہیں ہوگی۔''

یہ ایک ایسا عمل ہے جس پر عمل کرکے ہم پاکستانیوں نے اپنی بقا اور اپنی حفاظت کا بڑا قدم ایٹم بم بنا کر کیا ہے۔ یہ ایک ایسا ہتھیار اللہ تعالیٰ نے اپنی عنایات اور کرم نوازی سے ہمیں عطا کیا ہے کہ جس سے دشمن بھی خائف ہے وہ جانتا ہے کہ پاکستانی نہ صرف لڑنے بھڑنے کے لیے تیار ہوگئے ہیں بلکہ اس حد تک جانے کی صلاحیت بھی رکھتے ہیں کہ ایٹم بم کا استعمال کرنے سے گریز بھی نہیں کریں گے۔ اور یہی ہماری بقا کی ضمانت بن سکتا ہے۔ اور پھر یہ حکم نامہ بھی ہماری رہنمائی کے لیے موجود ہے:-

فَلَا تُطِعِ الْكٰفِرِيْنَ وَجَاهِدْهُمْ بِهٖ جِهَادًا كَبِيْرًا (الفرقان: ۵۲)

''تم کافروں کی باتوں میں نہ آؤ اور ان سے پوری طاقت سے لڑو۔''

اور پھر لڑنے کا انداز بھی بتا دیا:-

اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الَّذِيْنَ يُقَاتِلُوْنَ فِيْ سَبِيْلِهٖ صَفًّا كَاَنَّهُمْ بُنْيَانٌ مَّرْصُوْصٌ (الصف: ۴)

''یقیناً اللہ ان لوگوں سے محبت کرتا ہے جو اللہ کی راہ میں ایسے صف بستہ جہاد کرتے ہیں جیسے سیسہ پلائی ہوئی دیوار ہوں۔''

ان احکامات کی روشنی میں ہم یہ دیکھ سکتے ہیں کہ ہمارے مجاہدوں نے جو کچھ بھی قدم اٹھایا وہ عین اللہ کی مرضی کے مطابق تھا۔ اور اس پر مستزاد یہ کہ کسی جگہ پر بھی عام شہریوں کو نشانہ نہیں بنایا گیا بلکہ صرف وہ مقامات پاکستان کی ترجیح رہے جہاں سے دشمن ہمارے خلاف کارروائی کرتا رہا ہے یا کرسکتا ہے۔ شر کے ان مراکز کا خاتمہ انتہائی ضروری تھا اور ان کو ہی نشانہ بنایا گیا۔ ان کی فضائیہ نے ہمارے خلاف کارروائی کی تو اس کو بھی خاموش کر دیا گیا۔ یہاں تک کہ وہ رفائیل جنگی جہاز جن پر ان کو بڑا ناز تھا اور جس پر وہ اترا رہے تھے اس طرح ناکارہ کر دیے گئے کہ دشمن نے ان کو استعمال نہ کر کے مزید نقصان ہونے سے اپنے آپ کو بچا لیا۔ یہ سب کچھ جو ہوا وہ اللہ تعالیٰ کی کرم نوازی اور اس کی مہربانیوں کے ذریعہ سے ہوا۔ بے شک اللہ جسے چاہتا ہے عزت دیتا ہے اور جسے چاہے ذلیل وخوار کر دیتا ہے۔ اللہ پر بھروسہ کرنے اور اس کو یاد رکھنے کا حکم بھی ہے اور اس پر پوری قوم نے عمل کیا۔ اللہ کے حکم کے مطابق:-

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اِذَا لَقِيْتُمْ فِئَةً فَاثْبُتُوْا وَاذْكُرُوا اللّٰهَ كَثِيْرًا لَّعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْنَ (الانفال: ۴۵)

''مومنو! جب کفار کی جماعت سے تمہارا سامنا ہو تو ثابت قدم رہو اور اللہ کو بہت یاد کرو تاکہ تم کامیابی حاصل کرو۔''

ہم نے ان تین دنوں میں یہ دیکھا کہ پاکستانی عوام نے اللہ کے حضور بہت گڑ گڑا کر دعائیں بھی مانگیں اور کہیں پر بھی دشمن کے خوف سے سراسیمہ بھی نہیں دکھائی دیے۔

آج دس تاریخ ہوگئی ہے اور دونوں فریقوں میں جنگ بندی کا فیصلہ ہوگیا ہے۔ نتیجہ کے طور پر دونوں طرف سے توپیں خاموش ہوگئی ہیں۔ یہ فیصلہ وقتی ہے یا پھر کچھ عرصہ باقی رہے گا ہم فی الوقت کچھ نہیں کہہ سکتے۔ ہمارا دشمن چالاک بھی ہے اور انتہائی کمینہ بھی صلح نامہ کو کسی وقت بھی کسی بھی بہانہ سے پامال کرنے میں دیر نہیں لگائے گا۔ ابھی تک کی آمدہ خبروں کے تحت اس دشمن نے صلح کے باوجود بارڈر پر اشتعال انگیزی جاری رکھی ہوئی ہے۔ ہمیں بہر حال چوکنا بھی رہنا ہے اور خبردار بھی۔

اس جنگ بندی کے بعد کچھ معاملات ایسے ہیں جن پر ہمیں کچھ دیر کے لیے سوچ بچار کرنا چاہیے۔ آیئے ان کا جائزہ لیتے ہیں:-

① - جنگ بندی ہوتے ہی ہمارے وہ سیاستدان جو اب تک غائب تھے اپنے بلوں سے نکل آئے ہیں اور لگے ہیں پاکستانی فوج کی تعریف میں زمین و آسمان کے قلابے ملانے۔ فوج کی اچھی کارکردگی تمام قوم کے لیے قابل فخر ضرور ہے مگر اس میں لاف وگزاف کرنا اور بڑ بولے پن کی کوئی گنجائش نہیں ہے۔ ہمیں انتہائی عاجزی اور انکساری کے ساتھ اللہ سبحانہ وتعالیٰ کے آگے جھکنا چاہیے اور اس کا شکر ادا کرنا چاہیے کہ اس نے ہمیں اس قابل بنایا کہ ہم دشمن کے دانت کھٹے کرسکے۔ ہمارے تمام ٹی وی چینل بھی اسی طرز عمل کا شکار ہیں۔ ہم نے یہ دیکھا ہے کہ جو اپنی بڑائی کا ڈھول پیٹتے ہیں اوندھے منہ رسوائیوں کا شکار ہوتے ہیں۔ اللہ ہمیں محفوظ رکھے اور اپنا شکرگزار بنا کر رکھے۔

② - ہم نے جہاں کچھ کامیابیاں حاصل کی ہیں وہاں کچھ کمزوریاں اور خامیاں بھی یقیناً سامنے آئی ہوں گی۔ ان خامیوں کا ازالہ کرنا تو فوج کے ارباب اقتدار کے ہاتھوں میں ہوگا مگر ضروری بات یہ ہے کہ ان پر انتہائی سمجھداری سے غور کیا جائے اور ان کمزوریوں کو دور کرنے کی کوشش کی جائے۔

③ - ان چار دنوں میں ایک اچھی بات جو ظاہر

ہوئی ہے وہ ہے عوام الناس کی نظروں میں فوج کا گرتا ہوا وقار پھر سے استوار ہوتا نظر آیا۔ پچھلے دنوں سیاسی صورت حال اور فوج کے خلاف منفی پراپیگنڈا نے عوام کی نظروں میں فوج کو انتہائی نچلی سطح پر لا کھڑا کیا تھا۔ اور ایسا محسوس ہو رہا تھا کہ اب اگر جنگی صورت حال پیدا ہوئی تو ٦٥ء اور ٧١ء کی جنگوں کی طرح فوج کو عوام کی حمایت نہیں ملے گی۔ اور اس میں تو کوئی شک نہیں کہ کسی بھی ملک کی فوج خواہ کتنی ہی اچھی کیوں نہ ہو عوام کی حمایت اور ان کے ساتھ کے بغیر کوئی کامیابی حاصل نہیں کر سکتی۔ مگر اللہ کا شکر ہے یہ دیکھا گیا کہ ہماری پاکستانی عوام اس مرتبہ بھی اپنی فوج کے ساتھ شانہ بشانہ کھڑی تھی۔ یہ مقام شکر ہے فوج کے لیے بھی اور مقام غور ہے اپنے سیاستدانوں کے لیے بھی جنھوں نے اپنے مفادات کی خاطر فوج کے اوپر خوب خوب کیچڑ اچھالا مگر اللہ نے ان کی ان سازشوں کو دھو ڈالا۔

④-جنگی معاملات میں پاکستان کے ان نوجوانوں نے جنھیں آج کے دور کے کمپیوٹر اور الیکٹرک میڈیا کے استعمال کا علم اور تجربہ ہے، بڑا ہی اچھا کام کیا اور پاکستان کی فوج کا بھرپور ساتھ دے کر ہندوستان کی فوجی الیکٹرانک میڈیا کو ہیک Hack کر لیا اور ان کے بے شمار فوجی اداروں میں گھس کر انھیں ناکارہ بنا دیا۔ ان کے نیوی کے جہاز وکرانت کو ایسا جام کر دیا کہ وہ تقریباً ناکارہ ہو گیا اور اسے پیچھے ہٹنا پڑا۔ یہ ہندوستان کی بڑی سخت بے عزتی کے مترادف تھا۔ ان نوجوانوں کی اس کاوش اور بہترین کارکردگی کو پاکستان آرمی نے بھی سراہا اور ان کے ترجمان نے ایک پریس کانفرنس میں اس بات کا نہ صرف یہ کہ اعتراف کیا بلکہ خوب خراج تحسین بھی پیش کیا۔ میں ایک مرتبہ پھر کہوں گا کہ یہ سب صرف اور صرف اللہ کی تائید اور اس کی نوازشوں کی بنا پر ہوا اور اس کے لیے ہم اللہ کا جتنا بھی شکر ادا کریں کم ہے۔ یہ بات بھی واضح ہو گئی کہ جنگ پوری قوم مل کر لڑتی ہے اور کامیابی بھی اسی صورت میں ملتی ہے جب سب مل کر سیسہ پلائی ہوئی دیوار بن جائیں۔

⑤- جنگ بندی تو ہو گئی ہے مگر یہ وقتی ہے۔ ابھی دونوں اطراف کے لوگ مل بیٹھیں گے اور معاملات کو طے کریں گے۔ یہ بات تو معلوم ہے کہ ہمارا دشمن انتہائی کمینہ ہے اور کسی طور بھی نہ اپنی غلطی کا اعتراف کرے گا اور نہ ہی کسی قسم کی لچک اپنے رویہ میں کرے گا۔ نتیجہ کے طور پر تمام تر بات چیت کی ناکامی کا انتہائی زیادہ امکان ہے۔ ایسی صورت میں پاکستان کو اپنی حفاظت کا سامان کرنے سے غفلت نہیں کرنی چاہیے اور چوکنا اور ہمہ وقت تیار رہنا ضروری ہے۔ بین الاقوامی تجزیہ نگاروں کا کہنا ہے کہ اتنی شدید رسوائی کا سامنا کرنے کے بعد کہ جہاں اس کا سارا غرور خاک میں مل گیا ہو ہندوستان کا دوبارہ پلٹ کر حملہ کرنے کا امکان بہت زیادہ ہے۔ اس مرتبہ وہ جان کی بازی لگا کر آئے گا اور ہم سے چھ گنا بڑا فوجی دیو سنبھالنا بہت مشکل ہوگا۔ صرف استقامت اور اللہ تعالیٰ کے اوپر ایمان اور یقین کے بغیر اس دیو ہیکل پاگل کو روکنا کار دارد ہوگا۔ ہم اللہ کے آگے جھکتے ہیں اپنی کمزوری کا اعتراف کرتے ہیں، اپنے گناہوں سے معافی کے خواستگار ہیں اور اسی سے مدد اور اس کی نصرت کے طلبگار ہیں۔ ہم خلوص کے ساتھ رجوع کریں گے تو ہمارا اللہ بڑا ہی معاف کرنے والا اور مدد کرنے والا ہے۔

⑥- اس جنگی کارروائی میں سب سے بڑا ہاتھ الیکٹرانک وار فیئر کا ہے جس نے اتنی ترقی کر لی ہے کہ اپنی سرحدوں کو پار کیے بغیر بھی دشمن کے ہوائی جہازوں، ان کے اڈوں اور توپوں کو خاموش کرایا جا سکتا ہے۔ یہ موجودہ دور کی ایک نئی جنگی جہت ہے جس پر بہت کام ہوا ہے مگر پاکستان کو اس کا اعزاز حاصل ہے کہ ہم نے اس کو استعمال کیا اور خوب استعمال کیا۔ گو کہ ہماری یہ برتری چین کی مدد سے حاصل ہوئی ہے اور اس میں چین کے اپنے مفادات بھی یقیناً شامل ہوں گے۔ مگر ہمیں ہر چیز پر نظر رکھنی ہوگی۔ نہ بے تحاشا انحصار اچھا ہوگا اور نہ ہی ریشہ خطمی ہونے کی ضرورت ہے۔ ہمیں اپنے مفادات اور اور اپنی سالمیت کو مدنظر رکھنا ہے اور اس کی پوری ذمہ داری حکومت وقت اور فوجی سربراہان کے اوپر ہے۔ ہماری دعا ہے کہ اللہ انھیں اس ذمہ داری کو سمجھنے اور اس کو احسن طریقہ سے ادا کرنے کی توفیق دے۔ ہم جب بھی دوسری قوتوں پر اللہ کی طاقت سے زیادہ انحصار کرتے ہیں؛ تب بربادی اور ہلاکت کا شکار ہوتے ہیں اور یقیناً یہ ہماری ایمانی کمزوری کی علامت ہے۔ اللہ تعالیٰ پر مکمل بھروسہ اور اس کی مدد کے بغیر کچھ بھی حاصل نہیں ہوگا۔ یہ بات ہم پاکستانیوں کو جاننے اور سمجھنے کی ضرورت جتنی آج ہے اتنی شاید پہلے نہ تھی۔

حرف آخر

اللہ کا لاکھ لاکھ شکر اور احسان ہے کہ پچھلے ایک ہفتہ میں اللہ تعالیٰ نے پاکستان کے وقار کو بلند کیا۔ اور وہ ناکام ریاست جس کی نہ تو کوئی سیاسی اہمیت تھی اور نہ ہی معاشی مضبوطی، وہ آج ایک فاتح کے طور پر اپنا سر بلند کر کے کھڑی ہے۔ دنیا یہ کہہ رہی ہے کہ پاکستان کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ فرانس کی جنگی جہاز بنانے کی کمپنی کا پاکستان نے صحیح معنوں میں بھٹا بٹھا دیا ہے۔ اس کے ساتھ ہی چین کی دفاعی نظام اور اس سے متعلق تمام انڈسٹری کو ایک نئی جہت مل گئی ہے۔ پاکستان آرمی، جس کی صلاحیتوں کو دنیا صرف آئی ایس آئی کی تخریب کاری صلاحیتوں کو اجاگر کر کے دیکھ رہی تھی، آج معترف ہے کہ یہ ادارہ اپنی مثال آپ ہے۔ ملک کی سالمیت کی خاطر آئی ایس آئی جس طرح کام کرتی ہے وہ قابل ستائش ہے۔ اب اللہ سے دعا ہے کہ جو عزت اور وقار اللہ تعالیٰ نے قوم کی جھولی میں ڈال دی ہے، یہ قوم اب اس کی قدر کرے اور اپنے اعمال ایسے کر لے کہ تمام دنیا میں سر بلند ہو اور اس کو اس کا جائز مقام اقوام عالم میں مل جائے۔

آمین ثم آمین

ثقلین امام

غزہ بطور ایک "نیکرو پولیٹکل" زون اور مغربی تہذیب کا سیاہ کردار

اشیل میبے (Achille Mbembe) کا نظریہ "نیکروپولیٹکس" (Necropolitics) ہمیں غزہ کی صورتِ حال کو سمجھنے کے لیے ایک طاقتور فریم ورک مہیا کرتا ہے۔ اشیل میبے (Achille Mbembe) ایک افریقی مفکر، مؤرخ اور فلسفی ہیں جن کا تعلق کیمرون سے ہے۔ انھوں نے استعمار، نسل پرستی، طاقت اور "نیکروپولیٹکس" جیسے نظریات پر گہرا فکری کام کیا ہے۔ "نیکرو" کا مطلب ہے موت یا مردہ، "نیکروپولس" سے مراد ہے قبرستانوں کا شہر، اور "نیکروپولیٹکس" ایک ایسا نظریہ ہے جس کے مطابق ریاست یا طاقتور قوتیں یہ فیصلہ کرتی ہیں کہ کون زندہ رہے گا اور کون مرے گا۔ بعض لوگوں کو ایسی زندگی دی جاتی ہے جو درحقیقت موت سے کم نہیں ہوتی، ایسی حالت جہاں جینے اور مرنے کے درمیان کی حد مٹ جاتی ہے۔

میبے کے لیے نیکروپولیٹکس صرف اس بات کا سوال نہیں کہ کون ہلاک کیا جاتا ہے، بلکہ اس بات پر مرکوز ہے کہ کیسے پوری کی پوری آبادیوں کو ایسے حالاتِ زندگی میں دھکیل دیا جاتا ہے جہاں ان کا وجود اور نیستی (عدم وجود) کے درمیان فرق مٹ جاتا ہے۔ اس تناظر میں حاکمیت (Sovereignty) صرف قتل کے حق پر مبنی نہیں ہوتی، بلکہ مخصوص آبادیوں کو شعوری طور پر موت کے حوالے کرنے کے عمل سے چلائی جاتی ہے۔ موجودہ اسرائیلی قبضے اور محاصرے میں غزہ اس "نیکروپولیٹیکل منطق" (Necropolitical Logic) کی سب سے پر تشدد مثال ہے۔

غزہ کوئی خود مختار ریاست (Sovereign Entity) نہیں ہے، اور نہ ہی یہ مکمل روایتی انداز میں مقبوضہ علاقہ ہے۔ بلکہ، اسے وہ بہت سے ماہرینِ انسانی حقوق اور سیاسی مفکرین ایک "کھلی جیل" (Open-Air Prison) قرار دیتے ہیں ایک ایسا علاقہ جہاں بائیس لاکھ سے زائد انسان مکمل نگرانی (Surveillance)، نقل وحرکت پر سخت پابندی، اقتصادی ناکہ بندی (Blockade) اور بار بار ہونے والی فوجی بمباری کے سائے میں زندہ رہنے پر مجبور ہیں۔

اسرائیل غزہ کی سرحدوں، فضائی حدود، اور سمندری رسائی پر مکمل کنٹرول رکھتا ہے، اور بجلی، پانی، خوراک اور دوا جیسی بنیادی اشیاء کے بہاؤ کو کنٹرول کرتا ہے۔ وقتاً فوقتاً ہونے والے فوجی حملوں نے شہری انفراسٹرکچر کو تباہ کر دیا ہے، ہسپتالوں، اسکولوں، اور یہاں تک کہ پناہ گزین کیمپوں کو ملبے میں تبدیل کر دیا گیا ہے۔ یہ تشدد غیر معمولی نہیں بلکہ پالیسی اور نظام کا سوچا سمجھا حصہ ہے۔ یہ موت کو حکمرانی کے ایک معمول کی سٹریٹیجی کے طور پر رائج کرنے کی علامت ہے۔

میبے کا نیکروپولیٹکس ہمیں یہ سمجھنے میں مدد دیتا ہے کہ یہ سب کچھ صرف سیکیورٹی کا مسئلہ نہیں، بلکہ اس سے کہیں زیادہ ایک ایسے سماجی و سیاسی نظام کی پیداوار ہے جسے وہ "موت کی دنیائیں" (Death-Worlds) کہتے ہیں، ایسی جگہیں جہاں انسانوں کو "زندہ مردہ" کی حالت میں رکھا جاتا ہے۔ پرانے زمانے میں شاید کوڑھ کے مریضوں کو ایسی گھاٹیوں یا وادیوں محصور کر دیا جاتا تھا جہاں وہ بالآخر سسک سسک کے مرجاتے تھے، اُن کے علاج کے بارے میں سوچنا بھی محال تھا۔

غزہ کے عوام صرف بمباری یا جنگ میں نہیں مارے جاتے بلکہ ایک منظم "ساختیاتی تشدد" (Structural Violence) کے ذریعے رفتہ رفتہ غیر انسانی بنا دیے جاتے ہیں۔ صاف پانی کی عدم فراہمی، نکاسی کے نظام کی تباہی، اور طویل محاصرے کے نتیجے میں ہسپتالوں کا خاتمہ، یہ سب ایسی سٹریٹیجیز ہیں جو براہِ راست جنگ کیے بغیر زندگی کو مشکل تر کرنے کے لیے اپنائی جاتی ہیں۔ یہاں ریاست صرف "ہلاک" نہیں کرتی ہے، بلکہ "مرنے کے حالات پیدا کر دیتی" ہے، یعنی بنیادی سہولیات سے محروم رکھ کر موت کو غیر محسوس انداز میں واقع ہونے دیتی ہے۔

اس نیکروپولیٹیکل نظام کو قائم رکھنے اور اسے تقویت دینے میں مغربی تہذیب (Western Civilization) کا مرکزی کردار ہے۔ امریکہ (United States)، برطانیہ (United Kingdom) اور یورپی یونین (European Union) نہ صرف اسرائیل کو سفارتی اور سیاسی تحفظ

فراہم کرتے ہیں، بلکہ اس کو کنٹرول کے لیے مادی وسائل بھی مہیا کرتے ہیں۔ امریکہ ہر سال اربوں ڈالر کی فوجی امداد، جدید ہتھیار، میزائل ڈیفنس سسٹمز، اور نگرانی کی ٹیکنالوجی فراہم کرتا ہے، جو بعد میں غزہ میں استعمال ہوتے ہیں اور تباہ کن نتائج پیدا کرتے ہیں۔

مغربی حکومتیں بار بار ان بین الاقوامی قرار دادوں کو ویٹو یا کمزور کرتی ہیں جو اسرائیل کو جواب دہ بنانے یا اس کا احتساب کرنے کی کوشش کرتی ہیں، اور یوں اسرائیل کو اس کے انسانیت کے خلاف جرائم کو عملی نتائج سے بچا لیتی ہیں (آج ہی امریکہ نے غزہ میں جنگ بندی کی قرارداد کو پانچویں مرتبہ ویٹو کیا ہے)۔ یہ خاموشی درحقیقت اس جرم کی توثیق ہے کہ غزہ میں فلسطینیوں کو مارنا قابلِ قبول ہے۔ اور جب یہ انسانی گروہ جس کو ہلاک کیا جا رہا ہوتا ہے، وہ مزاحمت کرے تو اُسے دہشت گرد قرار دے کر پُر تشدد موت کی نیند سُلا دیا جاتا ہے۔ اس طرح غزہ یا دیگر مقبوضہ فلسطینی علاقوں میں اسرائیل کے بنائے گئے موت کے نظام کو مغربی تہذیب کی مکمل پشت پناہی حاصل ہے۔

یہ حمایت صرف پالیسی تک محدود نہیں بلکہ ایک نظریاتی دائرے (Ideological Domain) تک پھیلی ہوئی ہے۔ مغربی میڈیا اور سیاسی گفتگو بار بار ایسے استعماری (Colonial) اور نسل پرستانہ (Racial) بیانیے دہراتے ہیں جن میں فلسطینیوں کو غیر معقول، پُرتشدد یا غیر انسانی کے طور پر پیش کیا جاتا ہے، یہ وہی دلائل ہیں جو ماضی کی سلطنتوں نے اپنی فتوحات کو جواز دینے کے لیے استعمال کیے جاتے تھے۔ جب اسرائیلی تشدد کو ''خود دفاع'' (Self-Defense) اور فلسطینی مزاحمت کو ''دہشت گردی'' (Terrorism) کہا جاتا ہے، تو مغرب نہ صرف طاقت کے اس عدم توازن کو چھپانے کی شعوری کوشش کرتا ہے بلکہ یہ تاثر دیتا ہے کہ کچھ اقوام حقوق، تحفظ، یا زندگی کے قابل ہی نہیں ہیں!

ممبے کے نظریے سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ نیکروپولیٹکس کوئی حادثاتی رجحان نہیں بلکہ جدید سیاسی زندگی کے اندر بہت گہرائی سے پیوست ایک منظم منطق ہے، خاص طور پر ان علاقوں میں جو ما بعد استعماریت (Postcolonial) تاریخ اور نسل پرستی کا شکار رہے ہیں۔ اس نظریے کی روشنی میں غزہ نہ صرف ایک انسانی بحران (Crisis Zone) بلکہ ایک ''نیکروپولس'' (Necropolis) بن جاتا ہے۔

ایک ایسی جگہ جہاں موت کو منظم طریقے سے نافذ کیا جاتا ہے اور اسے حکمرانی کے ایک ''معمول'' میں ڈھال دیا جاتا ہے۔ اس نظام میں مغربی طاقتوں کی شمولیت کوئی اتفاقیہ یا غیر ارادی امر نہیں، بلکہ بنیادی اور ساختیاتی (structural) نوعیت کی ہے۔ ان کی فوجی حمایت، سیاسی اتحاد، اور نسل پرستانہ الفاظ وہ ڈھانچہ بناتے ہیں جس پر اسرائیل کی نیکروپولیٹیکل حکمرانی قائم ہے۔

غزہ کو نیکروپولیٹکس کے تناظر میں سمجھنا صرف بموں اور گولیوں کی ظاہری تشدد کا سامنا کرنا نہیں، بلکہ اس گہرے، زیادہ خفیہ اور مستقل تشدد کی نشاندہی بھی ہے، وہ تشدد جو ترک کر دینے، محصور کر دینے، اور امریکی قیادت والی مغربی تہذیب کی ملی بھگت کے ذریعے جاری رہتا ہے۔ غزہ کی تباہی میں ہم مغربی تہذیب کی ناکامی نہیں بلکہ اس کی سب سے خطرناک، مجرمانہ اور دیرینہ شکل دیکھتے ہیں۔

Necropolitics is a sociopolitical theory of the use of social and political power to dictate how some people may live and how some must die. The deployment of necropolitics creates what Achille Mbembe calls deathworlds, or "new and unique forms of social existence in which vast populations are subjected to living conditions that confer upon them the status of the living dead." Mbembe, author of *On the Postcolony*, was the first scholar to explore the term in depth in his 2003 article, and later, his 2019 book of the same name. Mbembe identifies racism as a prime driver of necropolitics, stating that racialized people's lives are systemically cheapened and habituated to loss.

[source: Wikipedia]

محمد تنزیل الصدیقی الحسینی

سلیم احمد صدیقی !!

ایک باضمیر اور روشن کردار رخصت ہوا

آئے پیام روز کسی کی وفات کا
دنیا میں سلسلہ ہے حیات و ممات کا

کوئی ایسا دن نہیں گزرتا جب اس دنیا میں کوئی روح قفس عنصری سے جدا نہ ہوتی ہو اور کسی نئے وجود کی آمد نہ ہوتی ہو۔ لوگوں کا آنا جانا روز اول سے جاری ہے اور روزِ قیامت تک یہ سلسلہ چلتا رہے گا۔ یہی دنیا کا دستور ہے۔ مگر کچھ افراد ایسے ہوتے ہیں جن کی موت محض ایک فرد کی وفات نہیں ہوتی بلکہ دل کے لیے ایک دائمی سانحہ بن جاتا ہے۔ جناب سلیم احمد صدیقی کی خبر وفات میرے دل پر ایسے ہی کسی سانحے کی طرح گزری۔

جانے والے نے ہمیشہ کی جدائی دے کر
دل کو آنکھوں میں دھڑکنے کے لیے چھوڑ دیا

۲۶ مئی کو جناب سلیم احمد صدیقی کی وفات ہوئی۔ صدیقی صاحب کی ذات اخلاق و تہذیب کا اعلیٰ نمونہ تھی۔ جن کی زندگی میں اللہ سے محبت بھی تھی اور اس کی خشیت بھی۔ میری دانست میں وہ صرف نسباً صدیقی ہی نہیں تھے بلکہ ان میں آثار صدیقیت بھی پائے جاتے تھے۔

سلیم احمد بن عظیم احمد بن حافظ عزیز احمد بن انور علی بن اکبر علی صدیقی لکھنؤ کے مشہور علمی و ادبی خانوادے سے تعلق رکھتے تھے۔ ان کی دادی عائشہ بی بی کا سلسلہ نسب ملا حمد اللہ سندیلوی سے جا ملتا ہے؛ اور ان کی دادی کی نانی مولانا فضل رحمن گنج مراد آبادی کی ہمشیرہ تھیں۔ جب کہ سلیم صدیقی کی نانی ام سلمیٰ خاتون؛ ملا جیون امیٹھوی کی پڑ پوتی تھیں۔

ان کے دادا حافظ عزیز احمد اور نانا مصطفیٰ احمد برادر عم زاد تھے۔ نیوتنی (ضلع اناؤ) اور لکھنؤ کے اطراف میں واقع سندیلہ، کاکوری وغیرہا مقامات میں نامور علمی و ادبی خانوادے زمانہ قدیم سے آباد تھے۔ یہ خانوادے نسبی اعتبار سے صدیقی، عباسی اور علوی تھے جن میں باہم کثرت سے رشتے داریاں قائم تھیں۔

خانوادہ فرنگی محل اور قدوائی خاندان سے بھی ان کے خاندانی تعلقات تھے۔ جب کہ ماضی قریب کی دینی، علمی و ادبی شخصیات مثلاً: مولانا عبد الماجد دریابادی، چوہدری خلیق الزماں، ڈاکٹر سلیم الزماں صدیقی وغیرہم سے بھی ان کی قرابت داری تھی۔

ان کے والد ڈاکٹر عظیم احمد صدیقی نے کنگ جارج میڈیکل کالج لکھنؤ سے ڈاکٹری کا امتحان پاس کیا تھا۔ وہ لکھنؤ ہی میں پریکٹس بھی کیا کرتے تھے۔ ان کا شمار لکھنؤ کے مشہور معالجین میں ہوتا تھا۔ ۶ جون ۱۹۶۸ء کو بعارضہ فالج لکھنؤ میں انتقال ہوا اور عیش باغ قبرستان میں مدفون ہوئے۔ ان کی والدہ رابعہ بانو بہت دین دار، نیک سیرت خاتون تھیں۔ ان کا انتقال ۱۰ مئی ۱۹۸۶ء کو لکھنؤ میں ہوا ان کی تدفین عیش باغ قبرستان میں ہوئی۔

سلیم احمد صدیقی کے دادا حافظ عزیز احمد نیوتنی سے تعلق رکھتے تھے مگر بسلسلہ معاش نیوتنی کی اقامت ترک کر کے لکھنؤ آ گئے تھے۔ لکھنؤ کے محلہ قاضی باغ میں ان کی سکونت رہی۔

سلیم احمد صدیقی کے نانا جناب مصطفیٰ احمد بن عابد علی بن اکبر علی صدیقی کی پیدائش نیوتنی (ضلع اُناؤ) میں ہوئی۔ بچپن ہی میں والد کے سایہ عاطفت سے محروم ہو گئے تھے جس کے بعد ان کے ماموں نذیر یار جنگ (جو حیدر آباد دکن میں چیف جسٹس تھے) اپنی بہن اور انھیں لے کر اپنے ساتھ حیدر آباد چلے آئے۔ مصطفیٰ احمد صدیقی نے حیدر آباد دکن ہی میں تعلیمی مراحل طے کیے اور تکمیل کے بعد پبلک سروس میں ملازمت اختیار کی اور ترقی کرتے کرتے تحصیل دار کے عہدے سے ریٹائر ہوئے۔ ریٹائرمنٹ کے بعد وہ اپنے گھرانے کے ساتھ لکھنؤ واپس چلے آئے۔ اس بار ان کے پاس ایک لاکھ روپے کی رقم تھی؛ جو اس زمانے کے اعتبار سے بہت بڑی رقم تھی۔

لکھنؤ کے قدیم محلہ کٹرہ بو تراب میں نواب تفضّل حسن خاں کی بارہ دری کے سامنے فراش خانہ تھا جسے مصطفیٰ احمد صدیقی نے خرید لیا جس کے بعد یہ فراش خانہ ''مصطفیٰ منزل'' بن گیا۔ آغا مہدی نے اپنی کتاب ''تاریخ لکھنؤ'' میں فراش خانہ کا مختصراً ذکر

کرتے ہوئے لکھا ہے:-

''بارہ دری کے سامنے فراش خانہ تھا جس کی زمین شیخ مصطفیٰ احمد تحصیل دار نے خرید کر مصطفیٰ منزل تعمیر کی۔ فراش خانہ میں دریاں، چاندنیاں، قالین، سوزنی مسند، گاؤ تکیہ، جازم اور کیا کچھ نہ تھا۔'' (ص: ۲۴۷)

جلد ہی ''مصطفیٰ منزل'' لکھنؤ میں علمی و ادبی سر گرمیوں کا مرکز بن گیا۔ جہاں لکھنؤ کے بڑے بڑے شاعر و ادیب تشریف لاتے اور مستقل ادبی بیٹھک کا یہاں اہتمام ہوتا۔ ''مصطفیٰ منزل'' تشریف لانے والوں میں اردو کے مشہور ناول نگار، عالم و ادیب علامہ عبد الحلیم شرؔر بھی تھے۔ شرؔر نسباً عباسی تھے مگر ننھیال کے توسط سے صدیقی تھے کچھ بعید نہیں کہ مصطفیٰ احمد صدیقی سے ان کی رشتے داری بھی ہو۔

مصطفیٰ احمد صدیقی کا انتقال ۱۹۴۰ء کی دہائی کے ابتدائی برسوں میں ہوا اور وہ قبرستان عیش باغ (لکھنؤ) میں مدفون ہوئے۔

سلیم احمد صدیقی نے جس ماحول میں آنکھ کھولا وہ علمی و ادبی اثرات کے ساتھ ساتھ سیاسی گہما گہمی کا دور بھی تھا۔ آزادی کی تحریک اپنے عروج پر تھی۔ ان کے خاندان میں مختلف فکر و خیال کے اہل علم یکجا ہو گئے تھے۔ جس میں عالم، ادیب، شاعر اور صحافی بھی تھے۔ اس وقت کے ماحول کے مطابق ان کی سیاسی وابستگیاں لیگ سے بھی تھیں اور کانگریس سے بھی۔ چند قریب ترین نمایاں افراد کا مختصراً تعارف حسبِ ذیل ہے:-

❁- صدیق احمد صدیقی؛ سلیم احمد صدیقی کے چچا تھے۔ حافظ قرآن اور عربی و فارسی کے ماہر تھے۔ اعلیٰ ادبی ذوق تھا، بعد میں ان کے مزاج پر ترقی پسند ادب کا غلبہ ہوا۔ ان کا شمار مشہور ترقی پسند ادیبوں میں ہوتا ہے۔ ۱۹۴۹ء میں وہ بی بی سی لندن سے وابستہ ہو گئے تھے۔ وہ وہاں اردو نشریات کے ذمہ دار تھے۔ لندن میں ان کا گھر ہندوستانی و پاکستانی اہل علم و ادب کا مرکز تھا۔ ۱۳ ستمبر ۱۹۵۸ء کو انھوں نے بروک وڈ (لندن) میں وفات پائی۔ ان کی وفات پر رشید احمد صدیقی، قرۃ العین حیدر جیسے مشاہیر اہل قلم نے ان کا نثری ماتم کیا۔

❁- مجتبیٰ احمد صدیقی؛ سلیم صدیقی کے ماموں تھے۔ انھوں نے مسلم یونی ورسٹی علی گڑھ سے بی ایس سی کا امتحان امتیازی نمبروں سے پاس کیا تھا۔ اس کے بعد وہ سعودی عرب چلے آئے جہاں وہ سلطان عبد العزیز بن سعود کے مشیر برائے زراعت مقرر ہوئے۔ تقسیم ہند سے قبل ہی وہ واپس ہندوستان آ گئے تھے اور یہاں طبی شعبے میں خدمات انجام دینے لگے۔ ان کا انتقال ۱۹۸۸ء میں ہوا۔

❁- شیخ شوکت علی صدیقی؛ سلیم احمد صدیقی کے خالو شیخ حشمت علی کے والد تھے اور ان سے براہ راست بھی رشتے داری تھی۔ محلہ رکاب گنج لکھنؤ کے مشہور وکیل تھے۔ لکھنؤ ایک زمانے میں تحریک مدح صحابہ رضی اللہ عنہم کا مرکز تھا۔ ان کا احاطہ شوکت علی اس تحریک کا مرکز بنا۔ یہیں تحریک مدحِ صحابہ رضی اللہ عنہم کے اجتماعات ہوتے تھے۔ بڑے بڑے علماء یہاں تشریف لاتے تھے۔ شیخ شوکت علی نے تحریک مدحِ صحابہ رضی اللہ عنہم کے لیے تمام مقدمات کی پیروی بلا معاوضہ کی۔ ۱۹۳۴ء میں ان کی وفات ہوئی۔

❁- انیس احمد عباسی؛ سلیم صدیقی کے خالو تھے۔ مشہور سیاسی صحافی تھے۔ مطلع صحافت پر ان کا اخبار ''حقیقت'' پوری آب و تاب سے روشن تھا۔ نظریاتی اعتبار سے کانگریسی تھے۔ جواہر لال نہرو سے ان کی اچھی دوستی تھی۔ چند کتابیں لکھیں اور تراجم بھی کیے۔ ان کا انتقال نومبر ۱۹۷۵ء کو کراچی میں ہوا۔

❁- پروفیسر غلام احمد فرقتؔ کاکوری؛ انیس احمد عباسی کے داماد اور سلیم احمد صدیقی کے رشتے میں بہنوئی تھے۔ وہ اردو کے مشہور شاعر، نقاد اور طنز نگار تھے۔ ان کی وفات جنوری ۱۹۷۳ء میں ہوئی۔

❁- علیم احمد صدیقی؛ سلیم احمد صدیقی کے بڑے بھائی تھے۔ ۱۹۶۲ء میں لکھنؤ یونی ورسٹی سے بی ایس سی (زولوجی) کا امتحان اچھے نمبروں سے پاس کیا۔ علمی و ادبی ذوق رکھتے تھے۔ ان کے مضامین ادبی رسائل و جرائد کی زینت بنتے تھے۔ تقسیم ہند کے بعد انھوں نے ہجرت نہیں کی اور اپنی والدہ کے ساتھ لکھنؤ ہی میں رہے۔ انھوں نے ۱۹ فروری ۲۰۰۲ء کو مکہ مکرمہ میں وفات پائی اور وہیں مدفون ہوئے۔ ان کی منتشر تحریروں کا ایک مجموعہ ''نقش علیمی'' کے عنوان سے ان کے صاحب زادے ڈاکٹر یوسف عظیم صدیقی نے مرتب کیا ہے جو مطبوع ہے۔

❁- کمانڈر اقبال رشید فاروقی؛ سلیم احمد صدیقی کے خالہ زاد بھائی تھے۔ پاکستان نیوی میں کمانڈر کے عہدے سے ریٹائر ہوئے۔ انھوں نے پاکستان نیوی میں کئی اہم ڈائریکٹوریٹ میں اہم ذمہ داریاں ادا کیں۔ نیوی کے شعبہ قانون میں بھی کافی کام کیا۔ نیوی کے بہت سے افسران کو پڑھانے کے ساتھ ساتھ تربیت بھی دی۔ اس کے علاوہ نیوی کیڈٹ کالج کو قائم کرنے میں اہم کردار ادا کیا اور اس کے پرنسپل بھی رہے۔ اپنی حتی الامکان کوششوں سے کئی اسلامی روایات انھوں نے نیوی میں جاری کرائیں۔ اچھا علمی و ادبی ذوق رکھتے تھے۔ ان کی دو کتابیں ''سمندر کی سسکیاں'' اور ''سانحہ خانہ کعبہ ۱۹۷۹ء'' ہیں؛ آخر الذکر کتاب راقم کی ترتیب و تدوین کے ساتھ طبع ہوئی ہے۔ کمانڈر اقبال رشید فاروقی کی وفات ۱۷ جون ۲۰۲۳ء میں ہوئی۔

خاندانی تذکرے اور چند قریب ترین احباب کے بعد اب آتے ہیں جناب سلیم احمد صدیقی کی زندگی کی طرف !!

سلیم احمد صدیقی صاحب کی ولادت ۱۹۴۴ء میں لکھنؤ میں ہوئی۔ ۱۹۵۹ء میں گورنمنٹ جوبلی کالج لکھنؤ سے انٹر کیا۔ ۱۹۶۷ء میں مسلم یونی ورسٹی علی گڑھ سے بی ایس سی انجینئرنگ کا امتحان پاس کیا۔ ان کی عملی زندگی کا آغاز ۲۸ مئی ۱۹۶۸ء کو

چٹاگانگ میں آئل کمپنی کے ساتھ انسلاک سے ہوا۔ ۱۹۷۰ء میں پاکستان نیوی میں سب لیفٹیننٹ کے عہدے سے اپنی خدمات کا آغاز کیا۔ ۱۹۹۷ء میں ترقی کرتے کرتے کموڈور کے عہدے تک پہنچے۔ ۲۰۰۰ء میں پاکستان نیوی سے اپنی شاندار خدمات انجام دینے کے بعد ریٹائر ہوئے۔

ریٹائرمنٹ کے بعد بھی وہ آخر وقت تک عمل کی مثال رہے۔ دینی، علمی و ادبی ماحول انھیں بچپن ہی سے ملا تھا جس نے ان کے مزاج و تربیت میں خاص اثر کیا تھا۔ مسلم یونی ورسٹی علی گڑھ کے تعلیم یافتہ تھے۔ ان کی شخصیت لکھنوی تہذیب و روایات کی آئینہ دار تھی۔

علی گڑھ اولڈ بوائز ایسوسی ایشن کے مستقل رکن اور نائب صدر رہے۔ سر سید یونی ورسٹی آف انجینئرنگ اینڈ ٹیکنالوجی کی بورڈ آف ڈائرکٹر کے ممبر اور عارضی طور پر اس کے وائس چانسلر بھی رہے۔

الغرض انھوں نے پاکستان میں دفاع اور تعلیم کے شعبے میں اپنی خدمات بحسن وخوبی انجام دیں۔

ڈاکٹر عبد القدیر خاں بھی مسلم یونی ورسٹی علی گڑھ کے سند یافتہ تھے۔ وہ بھی علی گڑھ اولڈ بوائز ایسوسی ایشن کے رکن تھے۔ اس اعتبار سے دونوں ہی میں باہم قریبی مراسم رہے۔ ہمارا مجلہ "الواقعۃ" صدیقی صاحب کے توسط ہی سے محسن پاکستان کی خدمت میں پہنچتا تھا۔

وہ خیر و فلاح کے کاموں میں سرگرمی سے حصہ لیتے تھے۔ وہ اپنی نیکیوں کی تشہیر قطعاً نا پسند کرتے تھے۔ مجلہ "الواقعۃ" سے بھی ان کا گہرا اور مخلصانہ تعلق تھا۔ اس کے تقریباً ہر خاص و عام شمارے میں ان کی معاونت شامل حال رہی ہے۔

میرے ساتھ ان کی رفاقت ۱۳ برسوں پر محیط رہی۔ اس عرصے میں میری ان سے ان گنت ملاقاتیں ہوئیں۔ عموماً اتوار کی صبح کو تقریباً ڈیڑھ سے دو گھنٹے کی نشست رہتی تھی۔ جس میں خال خال ہی کبھی ایسا ہوا کہ کوئی تیسرا بھی مجلس نشیں ہوا ہو۔ ان کی اکلوتی صاحبزادی جدہ میں اپنے شوہر اور بچوں کے ساتھ رہتی ہیں۔ وہ اکثر سعودیہ جاتے تھے۔ جب کبھی ایسا ہوتا کہ وہ سعودیہ یا کسی دوسرے ملک کے سفر پر روانہ ہوتے تو مجھے بطور خاص آگاہ کرتے کہ میں فلاں تاریخ سے فلاں تاریخ تک سعودیہ یا کسی دوسرے ملک جا رہا ہوں۔ مقصد یہ ہوتا تھا کہ اگر روانگی میں دن زیادہ ہوں تو ملاقات کر لی جائے ورنہ ان کی آمد کے بعد نشست ہوگی۔

ان کی طبیعت میں اخلاص وللّٰہیت کا غلبہ تھا۔ اللہ رب العزت کی جانب غیر معمولی میلان پیدا ہو گیا تھا۔ اکثر ایسا بھی ہوتا کہ ہماری دو دو گھنٹے کی پوری نشست صرف اللہ رب العزت کے ذکر ہی سے معمور رہتی۔ وہ رضائے الٰہی کے حصول کی جستجو میں رہتے تھے۔

ایک بار رسول اللہ ﷺ نے اپنے اصحاب سے فرمایا: "الا اخبرکم بخیارکم؟" "کیا میں تمھیں تمہارے بہترین افراد کے بارے میں نہ بتاؤں؟" صحابہ رضی اللہ عنہم نے فرمایا: "کیوں نہیں۔" آپ ﷺ نے ان کی نشانی بیان کرتے ہوئے فرمایا: "الذين إذا رؤوا ذكر الله۔" یعنی: "یہ وہ لوگ ہیں جنھیں دیکھ کر اللہ یاد آجائے۔" (مسند اسحاق بن راہویہ، کتاب الزھد)

بس ان کے ساتھ آخری برسوں میں میری بھی یہی کیفیت رہی کہ ان کے چہرے کو دیکھ کر مجھے اللہ یاد آجاتا۔

ندیمِ دوست سے آتی ہے بوئے دوست
افسوس اب یہ مجلسیں اور صحبتیں کہاں !!

وہ دینی مسائل کی تحقیق میں بھی بڑی دل چسپی رکھتے تھے۔ جب کوئی مسئلہ درپیش ہوتا تو ان کی خواہش ہوتی تھی کہ اس حوالے سے پوری تحقیق کر لیں۔ اکثر وہ اس ضمن میں مجھ سے اپنے سوالات کرتے اور میں جواب میں انھیں زبانی کلامی کی بجائے پورا مضمون لکھ کر پیش کرتا۔ میں چوں کہ مسئلے کے سارے پہلوؤں کا جائزہ لیتا تھا اس لیے انھیں کافی اطمینان ہو جاتا تھا۔ ایسے کئی مضامین اب بھی ہمارے میل پر محفوظ ہیں۔ تاہم جواب دینے میں مجھے کبھی ہفتے بھر کی تاخیر بھی ہو جاتی تھی۔

ایک بار انھوں نے مجھ سے قیام اللیل کے حوالے سے دریافت کیا۔ جس کا میں نے انھیں کافی تفصیلی جواب دیا تھا۔ اسی طرح زکات، کلمات استغفار، غزوۂ بدر کے قیدیوں، سیدنا معاویہ رضی اللہ عنہ کے قبول اسلام اور ان کے طرزِ حکمرانی کے حوالے سے ان کے سوالات مجھے یاد آ رہے ہیں۔

تقریباً چار برس قبل ان کے چھوٹے پوتے کی ولادت ہوئی۔ ان کے صاحبزادے کی خواہش تھی کہ اس کا نام اللہ کے مقرب فرشتے میکائیل علیہ السلام کے نام پر رکھا جائے۔ تاہم صدیقی صاحب کو اس پر اطمینان نہیں تھا۔ ان کا خیال تھا کہ انبیاء کرام علیہم السلام اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے ناموں پر نام رکھنے کا رجحان اور رواج تو ہے مگر فرشتوں کے مخصوص ناموں پر نام رکھنے کی نظیر عموماً نہیں ملتی۔ مزید یہ کہ اس نام کو مغربی دنیا میں میکائیل کی بجائے مائیکل پڑھنے اور کہنے کا عام رجحان ہے۔ چناں چہ انھوں نے اس حوالے سے مجھ سے دریافت کیا تو میں نے انھیں نومولود کا نام فرشتوں کے نام پر رکھنے کے حوالے سے مانعین و مجوزین کے دلائل پیش کرنے کے بعد یہ حاصل نتیجہ پیش کیا کہ مانعین کے پاس منع کی حدیث موجود ہے، خواہ ضعیف ہی سہی، جب کہ اس کے بالمقابل کوئی صحیح حدیث نہیں۔ مانعین کی مزید تائید سیدنا عمر فاروق رضی اللہ عنہ کے قول سے بھی ہوتی ہے اور اسلاف امت میں امام مالک کے قول سے بھی۔ جب کہ مجوزین کے پاس نہ کوئی حدیث ہے اور نہ ہی قول صحابی۔ الغرض مانعین کے دلائل مجوزین کے دلائل سے زیادہ مضبوط ہیں اور اکثر علماء کی یہی رائے ہے لہٰذا بہتر یہی ہے کہ مسلمان بچوں کے نام فرشتوں

کے نام پر نہ رکھے جائیں۔ ھذا ما عندی واللہ اعلم بالصواب۔ اس جواب سے وہ بہت مطمئن ہوئے۔ چنانچہ نومولود کا نام عیسیٰ رکھا گیا۔

صدیقی صاحب کا ذوق عبادت بھی عملاً بہت پختہ تھا۔ باقاعدگی سے نماز تہجد ادا کرتے تھے اور یہ ان کا کئی برسوں کا معمول رہا ہے۔ ان کے جنازے کے موقع پر ان کی مسجد کے امام نے یہ گواہی دی کہ انھوں نے صدیقی صاحب کو ہمیشہ صف اول کا نمازی پایا کبھی دوسری صف میں نہیں دیکھا۔

اسی طرح وہ جب کبھی مدینہ نبویہ تشریف لے جاتے تو وہاں بھی ان کی یہی کوشش ہوتی کہ پہلی صف میں شامل ہوں اس کے لیے گھنٹوں پہلے تشریف لے جاتے اور جب کامیاب ہوتے تو بہت خوش ہوتے تھے۔

وہ وقت کے بہت پابند تھے اور ان کی زندگی نظم و نسق کی خوب صورتی سے آراستہ تھی۔

خدا بخشے بہت سی خوبیاں تھیں مرنے والے میں

میرا ان سے تعلق لوجہ اللہ تعالیٰ رہا اور اس قدر گہرا رہا کہ میں نے اپنے چھوٹے بیٹے کا نام بھی ان کے نام پر سلیم شاہ صدیقی رکھا۔ ان شاء اللہ اب وہ ان کی یاد اور میری آنکھوں کی ٹھنڈک بن کر میری زندگی کے اختتام تک میرے ساتھ رہے گا۔

سلیم صدیقی صاحب کی زندگی شفاف اور مثالی تھی۔ ان کی ذات اصول، سچائی اور وقار کا استعارہ تھی۔ افسوس ہمارے عہد کا ایک باضمیر اور روشن کردار رخصت ہوا۔

نہ آنسوؤں سے ان کی جدائی کا غم مٹایا جا سکتا ہے اور نہ چند لفظوں میں ان کی بے شمار خوبیوں کو بیان کیا جا سکتا ہے۔ دعا ہے کہ ان کا مرقد جنت کے باغوں میں سے ایک باغ بن جائے، اللہ انھیں بہشت بریں کے پھولوں کا حق دار ٹھہرائے اور نعیم ابدی کا مستحق بنائے۔ وہ جس نے اپنی زندگی کے آخری کئی برس ابتغائے مرضات اللہ کی جستجو میں مسلسل سعی کرتے گزار دیے، اللہ اسے اپنی دائمی رضا مندی عطا فرمائے۔ آمین یا رب العالمین

بقیہ: یاد رفتگاں

- قبروں پہ تعمیرات کو درست نہیں سمجھتے۔
- توحید پہ بہت زور دیتے ہیں۔
- خلفاء راشدین کے دور کو بہترین اسلامی دور قرار دیتے ہیں۔
- خلفاء و اصحاب رسول ﷺ پر سبّ و شتم اور تبراء ولعن کو جائز نہیں سمجھتے۔
- علم، ذو الجناح، زنجیر زنی اور دیگر رسومات عزا داری کو بھی غیر شرعی سمجھتے ہیں۔
- تربت حسینی یا ٹکیے پر سجدہ کرنا ان کے خیال میں ضروری نہیں ہے۔ اس لیے وہ اب کارپیٹ یا قالین یا جائے نماز پر ہی سجدہ کرتے ہیں۔

موسوی کے ان ہی نظریات کی بنا پر متعدد شیعہ علماء نے انھیں مسلک تشیع سے خارج قرار دیا۔ اپنے مخصوص نظریات کی بنا پر انھیں نہ صرف سخت مخالفت کا سامنا کرنا پڑا بلکہ ذہنی و جسمانی اذیت سے بھی گزرنا پڑا۔ ان کے قتل کا فتویٰ دیا گیا۔ ان کی کتابوں پر پابندی لگائی گئی۔ تاہم موجودہ دور میں ان کی کتابیں نیٹ پر دستیاب ہیں۔ لیکن اس کا یہ مطلب بھی نہیں تھا کہ وہ عقیدۃً اہل سنت کے مماثل تھے۔ وہ بہر طور شیعہ ہی تھے اور خود کو عام اہل تشیع سے فرق کرنے کے لیے اپنا انتساب شیعہ علی کے طور پر کرتے تھے۔

اہل تشیع میں اصلاح عقائد و اعمال کی کافی سے زیادہ گنجائش ہے۔ بالخصوص حضرات علی و اہل بیت رضی اللہ عنہم سے متعلق غلو آمیز عقائد اور اصحاب رسول ﷺ پر سب و شتم سے اگر وہ باز آجائیں تو شیعہ سنی اتحاد کی عملی اور حقیقی شکل نکل سکتی ہے۔

ادارہ

بقیہ: تشریح سورہ فاتحہ

اب فرض کیجیے کہ ایک شخص ایک خون کرتا ہے اس کے بعد وہ عدالت میں پیش کیا جاتا ہے۔ حاکم اور جیوری سب کے سب ایمان دار اور دیانت دار ہیں۔ اس لیے حاکم اور جیوری سبھوں نے اس کو خونی سمجھا۔ خون کا بدلہ خون فیصلہ سنایا۔ وہ پھانسی پر لٹکا دیا گیا۔ یہ عدل ہوا انصاف ہوا۔ اب اسی جج یا جیوری کے اجلاس میں ایک دوسرے خونی کا مقدمہ پیش ہوتا ہے۔ چونکہ جج و جیوری سب کے سب دیانت دار ہیں اس لیے صحیح فیصلہ کرنے کی کوشش کرتے ہیں مگر اس دوسرے خونی کا مقدمہ اس کے دس خون کرنے کے بعد پیش ہوا ہے۔ نو خون تک یا تو پتہ ہی نہ لگا یا پتہ لگا تو گرفتار نہ ہو سکا۔ اب دسویں خون کے بعد وہ عدالت میں پیش ہوتا ہے اور دسوں خون کا قصور اس پر عاید ہوتا ہے اور ثابت بھی ہوتا ہے۔ حاکم اور جیوری سب دیانت دار ہیں اس لیے پھر اس کو پھانسی کا حکم سناتے ہیں۔

اب سوچنا یہ ہے کہ ایک خون کے بعد بھی ایک ہی پھانسی کی سزا اور دس خون کے بعد بھی ایک ہی سزا۔ اب دنیا کا حاکم اس معاملہ میں کر ہی کیا سکتا ہے۔ یہ طاقت اللہ تعالیٰ کے ہاتھ میں ہے۔ دس خون کرنے والے کو دس آدمیوں کی ناحق جان لینے کی تکلیف دینے والے کو اس کے دس خون کے برابر بدلہ دے یہ انسان کی قدرت کے باہر کی بات ہے۔ انسان اس معاملہ میں مجبور ہے اس لیے کسی حقیقی طاقت رکھنے والے کو ماننا اور صحیح صحیح بدلہ پانے والے کے دن کو ماننا عقلاً تسلیم کرنا پڑے گا۔ یوں تو ہر وہ شخص جو مذہبی ہونے کا دعویٰ کرتا ہے وہ کہے گا کہ ہم اللہ تعالیٰ کو مانتے ہیں اور اللہ تعالیٰ کو سمیع اور بصیر بھی مانتے ہیں اور قیامت کے آنے کو برحق جانتے ہیں لیکن ان چیزوں کی مان یا یقین کا نتیجہ اس کے فعل یا عمل سے ظاہر نہیں ہوتا ہو تو رسول اللہ ﷺ کے قول کے مطابق اس کا یہ دعویٰ غلط معلوم ہوتا ہے۔

محمد تنزیل الصدیقی الحسینی/ ادارہ

یادِ رفتگاں

❁ پروفیسر ساجد میر ❁ مولانا فضل الرحمٰن دھرم کوٹی ❁ حافظ حسین احمد ❁ مولانا قاری محمد شاہ زمان ❁ آغا شرف الدین موسوی

حافظ حسین احمد

۱۹ مارچ ۲۰۲۵ء کو جمعیت علمائے اسلام کے سینئر رہنما اور سابق سینیٹر حافظ حسین احمد وفات پا گئے۔

حافظ حسین احمد کی ولادت ۱۹۵۱ء میں کوئٹہ میں ہوئی۔ آنکھ کھولی۔ حفظِ قرآن مجید، ابتدائی دینی تعلیم اور اسکول کی تعلیم بھی کوئٹہ میں حاصل کی۔ حافظ صاحب کے والد مولانا عرض محمد جمعیت علمائے اسلام کے مرکزی رہ نماؤں میں سے تھے۔ حافظ صاحب دورانِ طالب علمی جمعیت طلبۂ اسلام میں متحرک رہے۔ ۱۹۷۳ء میں جمعیت علمائے اسلام کی رکنیت اختیار کی اور پہلی بار صوبائی اسمبلی کے رکن منتخب ہوئے، دوبار قومی اسمبلی اور ایک بار سینیٹ کے رکن منتخب ہوئے۔ وہ جب تک صحت مند رہے جمعیت کے مرکزی سیکریٹری اطلاعات کی حیثیت سے بڑا فعال کردار ادا کیا۔ وہ بڑے حاضر جواب، ذہین اور بذلہ سنج تھے۔ عوامی جلسوں یا پریس کے سامنے ان کے برجستہ جملوں اور بذلہ سنجی کی دھوم تھی۔ تلخ سیاسی حقائق کو بھی انتہائی شگفتہ اسلوب میں بیان کرنا ان کا خاصّہ تھا۔

حافظ صاحب کچھ عرصہ سے شوگر اور گردوں کی خرابی کے عارضے میں مبتلا تھے۔ دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ ان کی خطاؤں سے درگزر فرمائے اور ان کی مغفرت فرمادے۔ آمین!

ابو محمد معتصم باللہ

مولانا فضل الرحمٰن دھرم کوٹی

علامہ سید محمد یوسف بنوری کے شاگرد رشید، جامعہ علوم اسلامیہ علامہ بنوری ٹاؤن کے قدیم فاضل، جامعہ صدیقیہ بہاول پور و جامعہ دار العلم بہاولپور کے شیخ الحدیث، مدرسہ قاسمیہ خانقاہ شریف و مسجد قاسمی کے بانی و مہتمم، مولانا سیّد نفیس الحسینی کے خلیفہ مجاز مولانا فضل الرحمٰن دھرم کوٹی ۸۹ برس کی عمر میں ۳ اپریل ۲۰۲۵ء کو بہاول پور میں رحلت فرما گئے۔

ان کا آبائی تعلق دھرم کوٹ ضلع فیروز پور مشرقی پنجاب سے تھا۔ یہیں ۱۹۳۶ء میں ولادت ہوئی۔ ان کے والد مولانا محمد عبداللہ فاضل دیوبند اور مولانا عبد القادر رائے پوری کے خلیفہ مجاز تھے۔ مولانا کا ننھیال پاکستانی پنجاب کا مشہور مقام میاں چنوں تھا، اسی لیے تقسیم کے بعد یہاں آ گئے۔

جامعہ خیر المدارس ملتان، جامعہ رشیدیہ ساہیوال اور دار العلوم حقانیہ اکوڑہ خٹک اخذ علم کے بعد ۱۹۵۹ء میں جامعۃ العلوم الاسلامیہ علامہ بنوری ٹاؤن میں داخل ہوئے۔ یہاں مولانا سید محمد یوسف بنوری سے دورہ حدیث کیا۔ ۱۹۶۰ء میں دورہ حدیث پڑھ کر فراغت حاصل کی۔ یہ وفاق المدارس کے تحت مدارس کا پہلا امتحان تھا۔ اس وقت مولانا شمس الحق افغانی وفاق کے سرپرست اور مولانا مفتی محمود سیکرٹری جنرل تھے۔ مولانا فضل الرحمٰن دھرم کوٹی کو وفاق المدارس کے پہلے سال رول نمبر (ایک) الاٹ ہوا۔ یوں مولانا نے وفاق المدارس کے پہلے فاضل ہونے کا اعزاز حاصل کیا۔ وفاق المدارس میں دوسری اور جامعۃ العلوم الاسلامیہ علامہ بنوری ٹاؤن میں مولانا کی پہلی پوزیشن آئی۔

مولانا فضل الرحمٰن دھرم کوٹی نے بہاول پور میں مدرسہ قاسمیہ کی بنیاد رکھی۔ عظیم الشان مسجد قاسمی تعمیر کرائی۔ ۱۹۷۸ء سے جامعہ صدیقیہ پھر جامعہ دار العلم بہاول پور میں شیخ الحدیث کی مسند پر متمکن ہوئے اور تادم آخر بخاری شریف مکمل پڑھاتے رہے۔ تقریباً پچاس مختلف موضوعات پر مطبوعہ وغیر مطبوعہ تصانیف ہیں۔ تدریس کے ساتھ ساتھ جامع مسجد قاسمی میں خطابت اور یومیہ درسِ قرآن کا فریضہ بھی سرانجام دیتے رہے۔ آخر عمر میں اپنا مکان مسجد کو وقف کر کے مسجد میں خاطر خواہ اضافہ کیا۔ مولانا کے پاس ہزاروں کتب پر شاندار علمی ذخیرہ تھا جو انھوں نے مسجد و مدرسہ کے لیے وقف کر دیا تھا۔ دعا ہے کہ اللہ مولانا کی حسنات قبول فرمائے اور خطاؤں سے درگزر فرماتے ہوئے مغفرت فرمائے۔ آمین

ادارہ

مولانا قاری محمد شاہ زمان

علامہ سید محمد یوسف بنوری کے شاگرد اور جامع مسجد قباء بندھانی کالونی کراچی کے پیش امام وخطیب مولانا قاری محمد شاہ زمان ۵ اپریل ۲۰۲۵ء کو انتقال فرما گئے۔ ان کا آبائی تعلق بالاکوٹ سے تھا۔ انھوں نے جامعہ علوم اسلامیہ بنوری ٹاؤن کراچی میں درجہ خامسہ سے دورہ حدیث تک تعلیم حاصل کی اور ۱۹۷۴ء میں سندِ فراغت حاصل کی۔ ان کے اساتذۂ کرام میں علامہ محمد یوسف بنوری، مولانا فضل محمد

سواتی، مولانا محمد ادریس میرٹھی، مولانا بدیع الزمان، مفتی ولی حسن ٹونکی وغیرہم شامل ہیں۔

درسِ نظامی کی تکمیل کے بعد جامعہ میں صرف نو ماہ میں قاری عبد الغفار صاحب سے حفظِ قرآن کی سعادت حاصل کی۔ ۱۹۷۷ء سے جامع مسجد قباء بندھانی کالونی میں امام وخطیب مقرر ہوئے اور قرآن مجید کی تدریس فرماتے رہے، ہزاروں شاگردوں نے ان سے قرآن مجید پڑھا۔ تا دمِ وفات تقریباً نصف صدی اسی مسجد میں امامت وخطابت اور قرآن مجید پڑھتے پڑھاتے گزار دی۔ مولانا بندھانی برادری سے خاص قربت رکھتے تھے اور اس برادری میں ان کی بہت عزت تھی۔ پورے علاقے اور برادری میں ایک شفیق استاذ اور بزرگ کی حیثیت سے مانے جاتے تھے۔

ادارہ

پروفیسر ساجد میر

دینی وعلمی حلقوں میں یہ خبر یقیناً انتہائی دکھ کے ساتھ سنی جائے گی کہ پروفیسر ساجد میر ۳ مئی کو وفات پا گئے۔ وہ مرکزی جمعیت اہل حدیث پاکستان کے امیر اور وطن عزیز کے نامور دانش ور، اسکالر اور بزرگ سیاست دان تھے۔

پروفیسر ساجد میر ۲ اکتوبر ۱۹۳۸ء کو سیالکوٹ کے ایک علمی و دینی خانوادے میں پیدا ہوئے۔ ان کا تعلق مولانا محمد ابراہیم میر سیالکوٹی کے خاندان سے تھا۔ پروفیسر صاحب نے دینی و دنیاوی اعتبار سے اعلیٰ تعلیم حاصل کی۔

ان کی عملی زندگی کا آغاز ۱۹۶۰ء میں جناح اسلامیہ کالج سیالکوٹ سے انگریزی کے لکچرر کی حیثیت سے ہوا۔ اس کے بعد انھوں نے کئی درس گاہوں میں تدریسی خدمات انجام دیں۔ اپنی تدریسی خدمات کے ضمن میں وہ چند برس کے لیے نائیجیریا بھی تشریف لے گئے۔

ان کی مستقل تنظیمی وابستگی جمعیت اہل حدیث پاکستان کے ساتھ رہی وہ پہلے سکرٹری اور پھر ۱۹۹۲ء میں امیر منتخب ہوئے اور اپنی وفات تک امیر رہے۔

وہ ممبر سینیٹ آف پاکستان (اکتوبر ۱۹۹۴ء تا حال)، چیئرمین سٹینڈنگ کمیٹی آف سینیٹ برائے مذہبی امور (۱۹۹۴ء تا ۱۹۹۹ء) اور چیئرمین سٹینڈنگ کمیٹی آف سینیٹ برائے سائنس اینڈ ٹیکنالوجی (مارچ ۲۰۰۹ء تا حال) رہے۔

ان کے مضامین و مقالات کی تعداد بہت زیادہ ہے۔ مستقل تصانیف میں "عیسائیت، مطالعہ و تجزیہ" ان کی یادگار رہے۔

ان کی وفات سے موجودہ اہل حدیث جماعت و افراد ایک بزرگ سرپرست سے محروم ہو گئے۔

اتحاد عالم اسلامی اور امت مسلمہ کے لیے ان کی غیر متزلزل و مستقل فکر بنظر استحسان دیکھے جانے کے لائق ہے۔ امت مسلمہ کے ہر مسئلے کے لیے ان کی آواز امت کے اجتماعی مفاد میں بلند ہوئی۔ خواہ وہ مسئلہ فلسطین ہو یا کشمیر، میانمار و بوسنیا۔

وہ سیاسی وفکری اعتبار سے مولانا ثناء اللہ امرتسری، مولانا ابراہیم سیالکوٹی، مولانا محمد داود غزنوی رحمہم اللہ تعالیٰ کے جانشین تھے۔ ان کی وفات سے جو خلاء پیدا ہوا ہے اللہ اسے جلد پورا کرے۔ دعا ہے کہ رب العزت ان کے حسنات کو قبول فرما کر درجات بلند کرے اور خطاؤں سے درگزر فرمائے۔ آمین

محمد تنزیل الصدیقی الحسینی

آغا شرف الدین موسوی بلتستانی

مشہور شیعہ عالم ومصلح آغا شرف الدین موسوی بلتستانی ۲۱ جون کو انتقال کر گئے۔ ان کا تعلق بلتستان کے ایک گاؤں چھورکاہ محلہ علی آباد ضلع شگر سے تھا۔ وہ ایک مذہبی گھرانے سے تعلق رکھتے تھے اس لیے ان کی تعلیم کا خاص اہتمام کیا گیا۔ انھوں نے اعلیٰ تعلیم حوزہ علمیہ نجف (عراق) سے حاصل کی۔ وہاں انھوں نے کبار شیعہ علماء سے اخذ علم کیا؛ جن میں شیخ صادق تہرانی اور ملا باقر الصدر بھی شامل ہیں۔ نجف کے حوزہ علمیہ کے علاوہ انھوں نے قم کے حوزہ علمیہ سے بھی استفادہ کیا۔

آغا شرف الدین نے تکمیل علم کے بعد سرگرمی سے شیعہ کتب کی نشر و اشاعت کی۔ علمی و تصنیفی خدمات میں نمایاں کردار ادا کیا۔ اپنے استاد باقر الصدر کی "تفسیر موضوعی" کا اردو ترجمہ کیا۔

تاہم جس وجہ سے ان کی شہرت میں غیر معمولی اضافہ ہوا اور ان کی شدت سے مخالفت کی گئی وہ عام شیعہ عقائد ونظریات سے ان کی برملا مخالفت تھی۔ انھوں نے دلائل دے کر اہل تشیع میں رائج بدعات اور باطل افکار ونظریات کی نشان دہی کی۔ جس پر انھیں عمومی شیعہ حلقوں کی جانب سے سخت ردعمل کا سامنا کرنا پڑا۔

موجودہ شیعہ فکر اور آغا شرف الدین موسوی کے مابین چند مختلف فیہ امور یہ ہیں:-

۞- موسوی امامت کو نص قرآنی سے نہیں مانتے۔ ان کا یہ کہنا ہے کہ نص وہ ہوتی ہے جس میں کوئی ابہام نہ ہو اور جب امت کے ایک بڑے طبقے نے غدیر خم کے موقع پر رسول اکرم ﷺ کا خطبہ سننے کے باوجود مولا کے معنوں میں اختلاف کیا تو اس سے یہ پتا چلتا ہے کہ یہ نص نہیں ہے۔

۞- عام شیعی رجحانات کے برعکس خلافت کے باب میں وہ کہتے ہیں کہ سیدنا علی رضی اللہ عنہ نے ہمیشہ اپنی فضیلت کو معیار بنا کر خلافت پر اپنے حق کو ثابت کیا ہے اور نص کا ذکر نہیں کیا۔ اس کے علاوہ سیدنا علی رضی اللہ عنہ کا خلافت کی نامزدگی کے لیے ہونے والے ہر طریقہ کار میں شامل ہونا بھی اس بات کی دلیل ہے۔

۞- موسوی توسل کے مخالف ہیں۔

۞- نکاح متعہ کو غلط اور حرام سمجھتے ہیں۔

۞- تقیہ کو درست نہیں سمجھتے۔

۞- امام مہدی سے متعلق روایات کو صحیح نہیں سمجھتے۔ بلکہ ایسی تمام روایات کو افسانہ پردازوں اور قصہ سازوں کی گھڑی گئی روایات قرار دیتے ہیں۔

بقیہ صفحہ ۳۳ پر ملاحظہ کیجیے

مولانا طلحہ نعمت ندوی
استھانواں، بہار

نقد ونظر

اسلام اور عیسائیت کی کشمکش

راقم کو ابھی قریب میں دو اہم کتابوں کے مطالعہ کا موقع ملا، جن کا قدر مشترک یہودیوں اور عیسائیوں کی اسلام دشمنی اور اسلام کے خلاف ان کی سازشیں اور اس کی طویل تاریخ ہے، دونوں کے مصنفین پاکستانی ہیں اور علوم اسلامیہ پر عالمانہ نظر رکھنے کے ساتھ مغرب کے مزاج و مذاق سے پوری طرح واقف ہیں، اور اقبال کی زبان میں مشرق و مغرب کے میخانے ان کے دیکھے ہوئے ہیں۔

اول الذکر کتاب "فلسطین اور بین الاقوامی سیاسیات" ہے جس کے مصنف مولانا پروفیسر حبیب الحق ندوی نے دار العلوم ندوۃ العلماء کے فاضل اور سندھ یونی ورسٹی جامشورو کے استاد ہونے کے علاوہ امریکہ کی مشہور ہارورڈ یونی ورسٹی سے ڈاکٹریٹ کی سند حاصل کی تھی، وہاں ایک مدت گذار کر اہل مغرب کو قریب سے دیکھا تھا، پھر ڈربن یونی ورسٹی ساؤتھ افریقہ میں تاحیات تدریسی خدمت انجام دیتے رہے اور 1998ء میں وفات پائی۔

دوسری کتاب "اسلام اور مغرب تعلقات" ہے جو مشہور علمی شخصیت ڈاکٹر محمود احمد غازی کے قلم سے ہے، ڈاکٹر صاحب کی علوم اسلامیہ پر بھی بہت گہری نظر تھی، اور مغربی ملکوں کے بار بار دورے اور وہاں قیام کی وجہ سے ان کو قریب سے دیکھنے کا موقع ملا تھا۔

دونوں کتابوں کے مطالعہ سے مجموعی طور پر جو تاثرات ذہن میں آئے وہ یہ تھے کہ عیسائیوں نے ہر صورت میں اور اپنے سیکڑوں داخلی اختلافات کے باوجود اسلام کو اپنا حریف سمجھا، اور عیسائیت کے تحفظ ہی نہیں اس کے فروغ میں بھی سرگرم عمل رہے، اور اس کے لیے تبلیغ کا طریقہ بھی اختیار کیا اور جبر وتشدد کا بھی۔ اسلام کی ابتدائی دو تین صدیوں تک وہ عسکری مقابلہ سے تو باز رہے لیکن اسلام کے خلاف اندرونی سازشوں میں کمی نہیں کی، اور اس کے خلاف پروپیگنڈا بھی کرتے رہے۔ اس کے برعکس مسلمانوں کے بیشتر سلاطین کے پیش نظر اپنے مفادات زیادہ رہے۔

یہ بھی سچ ہے کہ صلیبی جنگ میں شکست کے بعد اہل صلیب نے اپنے مذہب کے فروغ کے لیے دیگر وسائل کے ساتھ تبلیغ اور مشن کا راستہ بھی اپنایا، اور جس خلوص کے ساتھ وہ اس مشن میں لگے رہے، اتنے اہتمام کے ساتھ مسلم دنیا میں فریضہ تبلیغ کی ادائیگی کی طرف توجہ نہیں رہی اور نہ اپنے دین کا فروغ اس حد تک ان کے پیش نظر رہا۔ اسلام نے اپنے دور آغاز ہی سے یہود و نصاریٰ کے ساتھ جس رواداری کا مظاہرہ کیا تھا اس کی مثال خود ان کے ہم مذہب سلاطین وحکام کے یہاں مفقود تھی، فلسطین کی فتح کے بعد ان کو اپنے مقدسات کی زیارت کی پوری آزادی حاصل تھی، لیکن اس کا صلہ ان کی طرف سے ہمیشہ سازشوں ہی صورت میں ملا۔ دوسری طرف مسلمانوں نے فریضہ تبلیغ کی اہمیت نہیں سمجھی، بلکہ اس سے زیادہ وہ کفر اور اہل کفر کی تذلیل وتوہین کو اصل سمجھتے رہے، جیسا کہ عہد وسطیٰ کے مسلم ادبیات سے واضح ہے، جب کہ خود رسول پاک علیہ السلام نے اہانت کفر سے زیادہ تبلیغ دین پر توجہ فرمائی تھی، کاش ہمارے سلاطین اس حقیقت کو بروقت سمجھتے اور حکومت کی طرف سے اس کا نظم کرتے۔

صلیبی جنگ کے اسباب ومحرکات کا جائزہ متعدد مورخین نے کسی حد تک لینے کی کوشش کی ہے لیکن ابھی بھی تحقیق کا حق باقی ہے، آخر وہ کیا اسباب تھے جنھوں نے صلیبیوں کو تین صدیاں اسلام کے تحت گزارنے کے بعد اسلام کے خلاف آمادہ جنگ کر دیا، اگرچہ اس سے قبل بھی مسیحی اسلامی جنگیں ہوتی رہی تھیں اور اندلس سے لے کر مراکش تک متعدد اہم معرکے ہو چکے تھے، ۱۰۹۵ء مطابق ۴۸۷ھ میں پوپ کی پہلی تقریر سے پہلی صلیبی جنگ کی تیاری شروع ہوئی، اور پورے یورپ کو متحد کیا گیا۔ اس کے اسباب یہ بتائے جاتے ہیں کہ یروشلم میں مسیحی زائرین پر ظلم ہونے لگا تھا، لیکن خود عیسائی مورخین جن میں ایڈورڈ گبن سرفہرست ہے جس کی تاریخ زوال روما بہت ہی اہم ماخذ ہے، اس کا انکار کرتے ہیں۔ دو تین جنگوں کے بعد یروشلم پر قبضہ میں کامیابی اور پھر نوے سال کے بعد صلاح الدین کی اس کی بازیابی کے بعد پھر اس کے قبضہ کی مسلسل کوششیں ہوتی رہیں، ادھر اندلس سے مسلمانوں کو نکالنے کی سازشیں بھی ہوتی رہیں۔

پندرہویں صدی اس اعتبار سے بہت اہم تھی کہ اس میں عالم اسلام اور مسیحی دنیا کی فتح وشکست کے کئی اہم واقعات پیش آئے، چنانچہ ۱۴۵۳ء میں قسطنطنیہ فتح ہوا، پوپ پاس دوم نے ۱۴۶۴ء میں آخری صلیبی جنگ کی کوشش کی، اس میں شکست کے بعد اہل یورپ کی ہمت ٹوٹ گئی لیکن پروفیسر حبیب الحق ندوی کے بقول ان میں روح صلیب زندہ رہی اور ۱۹۶۷ء

کو سقوط بیت المقدس اسی روح کی عملی تعبیر تھی۔ ۱۴۹۲ء میں غرناطہ کے سقوط کے ساتھ اندلس بلکہ یورپ کے وسط سے مسلمانوں کا مکمل انخلاء ہو گیا، اس کے بعد اہل یورپ نے استعماری کوششیں شروع کیں، اور اسی کے ساتھ مشنری اور تبلیغی مشن کا آغاز بھی کیا۔ اس سے قبل سقوط بغداد اور تاتاری حملوں میں عیسائیوں کی در پردہ کوششیں کسی طرح کم نہیں تھیں۔

چنانچہ اس کے بعد اہل یورپ دنیا کی تلاش میں نکلے، اور اپنی عیاری و چالبازی سے بہت سے ملکوں پر قبضہ کیا، ایشیا اور افریقہ میں اپنی نو آبادیاں قائم کیں، بالخصوص مشرق وسطی کی طرف توجہ کی، لیکن سلطنت عثمانیہ کی وجہ سے یہاں انھیں بہت زیادہ کامیابی نہیں مل سکی، البتہ مشرق میں چین و روس میں وہ خاموشی سے اپنا کام کرتے رہے، دور دراز مسلم علاقوں میں بھی جہاں مسلم ثقافت مضبوط نہیں تھی انھوں نے اپنی تبلیغی کوششوں کے ذریعہ عیسائیت کو فروغ دیا، مسلمانوں کے یہاں اہل کتاب خواتین سے شادی کی گنجائش تھی، مسیحی یورپ نے اس سہولت سے بھی فائدہ اٹھایا اور امراء و سلاطین کے درباروں میں اپنی خواتین کے ذریعہ اپنے مذہب کے فروغ و استحکام کی کوششیں کرتے رہے، اس کے ساتھ ہی اٹھارہویں صدی کے آغاز سے ان کے استعماری نظریہ نے عملی رنگ اختیار کر لیا، اور وہ تقریباً ایشیا و افریقہ کے بڑے حصہ پر قابض ہو گئے، اور یہاں اپنی فکر اور تہذیب کے ساتھ اپنا مذہب بھی نافذ کرنے کی کوشش کی۔

ڈاکٹر محمود احمد غازی نے بھی اپنے مختلف خطبات اور مقالات کے ذریعہ ان کے عزائم پر روشنی ڈالی ہے، چنانچہ انھوں نے اپنی تقریر "عیسائیت کے بین الاقوامی عزائم" میں بتایا ہے کہ یورپ یہ دعویٰ کرتا ہے کہ وہ غیر جانب دار ہے، لیکن وہ مکمل جانب دار ہے، آپس میں ہزار دشمنی اور مذہب بیزاری کے باوجود وہ اسلام دشمنی ہی نہیں عیسائیت کے فروغ میں بھی متحد ہو کر سرگرم ہے، مسلم ممالک میں عیسائیت کا فروغ اس کا خاص مطمح نظر ہے، انھوں نے بتایا ہے کہ یورپ کا ایک بہت تعلیم یافتہ آدمی پاکستان کے ایک معمولی سے دور افتادہ دیہات میں آ کر اپنے مذہب کے فروغ میں اپنی زندگی گذار دیتا ہے جس کی مثال ہماری قریب کی تاریخ میں نہیں ملتی۔ انھوں نے یہ بھی بتایا ہے کہ عیسائیوں نے انیسویں صدی کے آغاز میں جب اپنی تبشیری مہم تیز کی اور استعمار کے ساتھ اس پر بھی پوری طاقت صرف کر دی تو انھیں سمجھ میں آیا کہ تین اسباب ایسے ہیں جو مسلمانوں میں عیسائیت کے فروغ میں رکاوٹ بن رہے ہیں، لہٰذا انھوں نے ان تینوں کو ختم کرنے کی کوشش کی۔ پہلی رکاوٹ سلطنت عثمانیہ تھی، جو عیسائی پادریوں کے مقابلہ کے لیے علماء کی حوصلہ افزائی بھی کرتی تھی اور عیسائیت کے فروغ پر پابندی بھی لگاتی تھی، انھوں نے سلطنت عثمانیہ کو توڑنے میں پورا زور صرف کر دیا اور آخر سازشوں کے ذریعہ اس میں کامیاب ہوئے۔ دوسری وجہ ارتداد کی سخت سزا تھی جو مسلمانوں میں عیسائیت کے فروغ میں بہت بڑی رکاوٹ بن رہی تھی، انھوں نے اس کو موضوع بحث بنا کر اس کو ختم کرانے کی کوشش کی، یہاں تک مسلمانوں کے علمی حلقہ میں اس سلسلہ میں متعدد رجحانات پیدا ہو گئے، اور مسلمانوں کو باور کرایا گیا کہ تبدیل مذہب کی سزا اتنی سخت نہیں ہے۔ تیسری رکاوٹ علماء سے مسلم معاشرہ کا تعلق تھا، چنانچہ انھوں نے مسلمانوں کے درمیان علماء کو بدنام کر کے ان کو عام مسلم معاشرہ سے کاٹنے کی کوشش کی۔ ڈاکٹر غازی کے بقول اس کے باوجود وہ مسلمانوں کو عیسائیت کی طرف لانے میں بہت زیادہ کامیاب نہیں ہوئے تو غیر مسلموں کی طرف توجہ کی، اور مسلمانوں میں الحاد کو فروغ دینے کی کوشش کی، اور آزاد خیال مسلمانوں کو آگے بڑھایا اور ان کی حوصلہ افزائی کی۔

ڈاکٹر صاحب نے یہ بھی بتایا ہے کہ قرآن پاک میں اولین دو سورتیں سورہ بقرہ اور سورہ آل عمران سب سے پہلے کیوں ہیں، اس کی توجیہ مختلف مفسرین نے الگ الگ کی ہے، لیکن غور کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ سورہ بقرہ یہودیوں اور سورہ آل عمران کا بیشتر حصہ عیسائیوں کے تذکرہ پر مشتمل ہے، اور یہ شاید اس طرف اشارہ ہے کہ امت مسلمہ جب اپنا بین الاقوامی کردار ادا کرنے کے لیے کھڑی ہو گی تو ان دونوں مذاہب کی طرف سے اسے سخت رکاوٹیں پیش آئیں گی، اس لیے ان کے مزاج اور ان سازشوں سے با خبر رہنے کی ضرورت ہے، انھوں نے یہ بھی لکھا ہے کہ مسلمانوں کی پوری تاریخ اس کی گواہ ہے اور ایسا لگتا ہے کہ حضرت مسیح علیہ السلام کی آمد تک ان کی سازشوں کا سلسلہ جاری رہے گا۔

پھر انھوں نے بتایا ہے کہ وقتاً فوقتاً ان کے یہاں اجتماعات میں اس پر غور کیا جاتا ہے کہ آخر عیسائیت کے فروغ میں کیا چیزیں رکاوٹ بن رہی ہیں، ان کا جائزہ لیا جاتا ہے، اور خاموشی سے ان کو دور کرنے کی کوشش کی جاتی ہے، یہ وہ تنظیمی کوششیں ہیں جن پر ہم مسلمان بھی سنجیدگی سے غور کر سکتے ہیں، انھوں نے بین الاقوامی اسلامی نظام کے لیے تجارت کو ایک اہم وسیلہ کے طور پر استعمال کرنے کا مشورہ دیا ہے، اور اس کے لیے عہد نبوی کی مثالیں بھی دی ہیں، اور بتایا ہے کہ مسلم ممالک بین الاقوامی اور عالمی تجارت میں اپنے قومی مفادات پیش نظر رکھ کر اور آپس میں مربوط ہو کر بہت سے مسائل کو حل کر سکتے ہیں، تیسری دنیا کے کئی پلیٹ فارم ایسے ہیں جن کی قیادت مسلمانوں کے ہاتھ میں ہے، کاش مسلمان یہ سمجھ سکتے کہ ہم مجموعی طور پر ایک ہو کر اپنے تمدن اور معاشی و عسکری قوت کو کس طرح بڑھا سکتے ہیں۔

کاش وہ یہ سمجھ سکتے کہ وَلَنْ تَرْضٰى عَنْكَ الْيَهُوْدُ وَلَا النَّصٰرٰى حَتّٰى تَتَّبِعَ مِلَّتَهُمْ (البقرۃ: ۱۲۰) ایک حقیقت ہے۔ کاش وہ یہ سمجھ سکتے کہ ان کے ذاتی مفاد کا تحفظ بھی قومی مفادات کے تحفظ ہی میں مضمر ہے اور دعوت و قوت ہی اصل ہتھیار ہے۔

محمد تنزیل الصدیقی الحسینی

تبصرہ کتب

تبصرے کے لیے کتاب کے دو نسخوں کا آنا ضروری ہے۔

مقالات و فتاویٰ

ڈاکٹر صہیب حسن

صفحات: ۵۷۲ مجلد

ناشر: مکتبہ ضیاء السنۃ، گلی نمبر ۶۲، جی- ۱۰ / ۴، اسلام آباد

ڈاکٹر صہیب حسن موجودہ دور کے جلیل المرتبت علمائے کرام میں سے ایک ہیں۔ تبلیغ دین ہو یا تصنیف و تالیف؛ انھوں نے مختلف جہت سے دین کی خدمت کی اور ہنوز کر رہے ہیں۔ وہ خاندانی عالم اور ایک نامور علمی خانوادے کے رکن ہیں۔ ان کا خاندان اہل علم کا گہوارہ تھا اور آج بھی ان کے یہاں علمی روایات کافی مضبوط ہیں۔ ان کے پر دادا مولانا عبد الجبار عمر پوری (وفات: ۱۹۱۳ء) سید نذیر حسین محدث دہلوی کے تلمیذ رشید تھے اور ان کے والد مولانا عبد الغفار حسن (وفات: ۲۰۰۷ء) ماضی قریب کے نامور عالم و مدرس تھے۔ ڈاکٹر صہیب حسن القرآن سوسائٹی لندن کے صدر بھی ہیں۔ عرصہ دراز سے اسلامی شریعہ کونسل برطانیا کے سکرٹری کے فرائض بھی انجام دے رہے ہیں۔ انھوں نے کئی کتابیں لکھیں اور چند تراجم بھی کیے ہیں۔

زیر تبصرہ کتاب ان کے ''مقالات و فتاویٰ'' کا مجموعہ ہے اور اسی نام سے ہے۔ کتاب اصولی طور پر دو حصوں میں منقسم ہے؛ مقالات اور فتاویٰ۔ مقالات و مضامین مختصر بھی ہیں اور بعض طویل بھی۔ اور متنوع موضوعات کا احاطہ کرتے ہیں۔

ان کا پہلا مضمون ''الفاتحہ اور قرآن کی سورتوں کا باہمی تعلق'' کے عنوان سے ہے۔ الفاتحہ قرآن کی پہلی سورت ہے۔ ڈاکٹر صاحب نے بڑی خوبصورتی سے اس ربط کو قرآن کی بعض سورتوں کے ساتھ بیان کیا ہے۔ بالخصوص قرآن کریم کی آخری سورۃ الناس کے ساتھ ربط بیان کرتے ہوئے تمہیداً لکھتے ہیں:-

''جس طرح کرہ ارض گول ہے اسی طرح اگر سارے قرآن کو ایک طویل صحیفہ پر لکھ کر گولائی میں لپیٹ لیا جائے تو سورۃ الناس اور سورۃ الفاتحہ ساتھ ساتھ نظر آئیں گے یعنی قرآن کا اول، آخر سے مربوط نظر آئے گا۔'' (ص: ۲۳)

سورۃ التین کے اسرار و رموز بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں:-

''سورۃ التین میں چار چیزوں کی قسم کھائی گئی ہے اور اس کے بعد کہا گیا کہ ہم نے انسان کو بہترین ساخت پر پیدا کیا ہے اور اس کے بعد اسے اسفل سافلین میں دھکیل دیا ہے، سوائے ان لوگوں کے جو ایمان لاتے ہیں اور عمل صالح سے بہرہ ور ہوتے ہیں۔ یہاں جن چار چیزوں (انجیر، زیتون، طور سیناء، بلد امین) کی قسم کھائی گئی ہے انھیں اس بات پر شاہد ٹھہرایا گیا ہے کہ بنی نوع انسان کی زندگی میں عروج بھی ہے اور زوال بھی، اور زوال سے باہر نکلنے کا راستہ بھی۔'' (ص: ۳۷)

ایک فکر انگیز مضمون ''دعائیں کیوں بے اثر رہیں؟ نصرت الٰہی کیوں نہ آئی؟'' میں مسلمانوں کی موجودہ صورت حال کا جائزہ لیا گیا ہے اور اس زوال سے نکلنے کی راہ دکھائی گئی ہے۔ لکھتے ہیں:-

''ایمان کے سوتے حبل اللہ (قرآن) سے پھوٹتے ہیں، قرآن کا جزو اعظم توحید باری تعالیٰ کا اقرار اور تمام عبادات کو خالص اللہ کے لیے قرار دینا ہے۔'' (ص: ۷۸)

کتاب میں موجودہ امت مسلمہ کے تعلق بعض اہم فکری نوعیت کے مضامین بھی شامل ہیں۔ جیسے فلسطین اور یہود کے تعلق سے چند اہم اور قیمتی مباحث کتاب میں آ گئے ہیں۔

یہود کے تعلق سے جئنابکم لفیفا کی تفسیر میں کئی اہم اقوال اور امکانات کا جائزہ لیا گیا ہے۔

''ڈاکٹر اسرار احمد کا تصورِ خلافت'' ایک اہم فکری نوعیت کا طویل مضمون ہے جس میں ڈاکٹر صاحب کے ساتھ ساتھ مولانا ابو الکلام آزاد، مولانا مودودی اور بعض دیگر معاصر رجحانات کا جائزہ بھی اختصار کے ساتھ پیش کیا ہے۔ ڈاکٹر اسرار سے متعلق لکھتے ہیں:-

''گو ڈاکٹر اسرار جمعیت اور جماعت کے تعلق سے عملی طور پر صرف پانچ سال مولانا (مودودی) کے ہمسفر رہے ہیں۔ (تاہم) وہ سحر مودودی سے کبھی نکل نہیں پائے۔ وہ ان کے اس فکر کے پیغامبر ہیں جو انھوں نے تقسیم سے پہلے اجاگر کیا تھا۔'' (ص: ۲۷۰)

بعض معاصر اہل علم پر تاثراتی اور سوانحی نوعیت کے مضامین بھی ہیں۔ ان معاصر اہل علم میں: مولانا سید داود غزنوی، پروفیسر ابوبکر غزنوی، مولانا امین احسن اصلاحی، حکیم عبد الرحیم اشرف، شیخ عبد العزیز بن باز،

شیخ محمد بن عبد اللہ السبیل امام حرم، ڈاکٹر اسرار احمد اور شیخ صالح الحصین شامل ہیں۔

پروفیسر ابوبکر غزنوی لندن گئے تھے کہ وہیں سڑک پار کرتے ہوئے ان کا ایکسیڈنٹ ہو گیا۔ جس کے بعد چند دن ہسپتال میں شدید علالت میں رہے اور پھر یہی سانحہ ان کے سفر آخرت کا سبب بن گیا۔ فاضل مولف کو اس سانحے کا علم ہوا تو طبعی طور پر بہت افسردہ ہوئے اور عیادت کے لیے حاضر ہوئے، لکھتے ہیں:-

''مولانا کے سرہانے چھوٹی سی الماری میں سے ایک کاغذ جھانکتا نظر آیا جس پر پنج وقتہ نمازوں کی فہرست تھی اور ہر نماز کے ذکر کے بعد اثبات ونفی کے نشانات تھے۔ اللہ اللہ یہ نحیف و نزار، جان لیوا حادثے کا شکار نمازوں کی ادائیگی پر کتنا بے تاب ہے۔'' (ص: ۴۱۴-۴۱۵)

اپنے استاد شیخ ابن باز پر بہت عمدہ اور موثر مضمون لکھا ہے، مضمون کے آغاز ہی میں لکھتے ہیں:-

''یقیناً ہمارے استاد و مربی سماحۃ الشیخ عبد العزیز بن باز انھی امتیاز کے حامل رجال میں سے تھے کہ جن کے وجود سے اسلاف کی یاد تازہ ہوتی تھی اور کن کی ہمہ گیر اور بھرپور زندگی بہتوں کے لیے مشعل راہ بنی رہے گی۔ شیخ ابن باز انیس سال کی عمر میں اپنی بینائی کھو بیٹھے لیکن اللہ تعالیٰ نے انھیں ایسی بصیرت سے نوازا کہ جس پر ہزاروں بصارتیں قربان ہوں۔'' (ص: ۴۲۵)

فاضل مولف ڈاکٹر اسرار احمد سے بہت قریب بھی رہے اور متاثر بھی۔ ان پر ایک طویل تاثراتی مضمون ''وہ میر کارواں تھا جو چلا گیا'' کے عنوان سے لکھا؛ جو شاملِ کتاب ہے۔ تاہم اس تاثر، عقیدت اور احترام کے باوجود وہ اپنے ممدوح کی دعوت پر ان کی قائم کردہ ''تنظیم اسلامی'' کے رکن نہیں بنے۔ لیکن وہ ''تنظیم اسلامی'' کے ہمدرد رہے اور اس کی خدماتِ دین کے مداح۔ خوش گوار امر یہ ہے کہ اس انکار کے باوجود دونوں کے باہمی روابط پر کوئی اثر نہیں پڑا۔

کتاب میں بعض گمراہ فرقوں پر معلوماتی مضامین بھی شامل ہیں جیسے ''یزیدیہ''، ''نصیریہ'' اور ''قادیانیت''۔

کتاب کے سلسلہ مضامین میں بعض کتابوں پر تبصرے بھی ہیں۔

کتاب کا دوسرا اور آخری حصہ فتاووں پر ہے۔ بیشتر فتاوے مختصر ہیں الا ما شاء اللہ۔

کتاب میں پروف ریڈنگ کی کچھ اغلاط پائی جاتی ہیں بحیثیت مجموعی کتاب کی طباعت اور پیشکش عمدہ ہے۔

کتاب کے حوالے سے فاضل مولف کی خدمت میں ہماری چند تجاویز ہیں:-

① - کتاب میں جو سلسلہ مضامین ہیں ان میں سے بعض نوعیت کے اعتبار سے جداگانہ اور مستقل کتاب کا تقاضا کرتے ہیں۔ جیسے قرآنی مقالات ومضامین، یادِ رفتگاں، نقد ونظر اور فتاوے۔ فاضل مولف کا قلم جواں ہے۔ اس عہد تشتت و زوال میں وہ خود علم و فضل کا بحر بیکراں اور ماضی قریب کی عظمتوں کے شاہد و امین ہیں۔ اس لیے وہ اگر ہمارے پیش کردہ عناوین پر اپنی قلمی جولانیوں کی تعداد میں اضافہ فرمائیں تو ان شاء اللہ جلد ہی کتابوں کی یہ سیریز تیار ہو سکتی ہے۔

② - کتاب میں بعض رودادیں اور رپورتاژ ہیں جن میں سے بعض تو دوسروں کے قلم سے ہیں۔ ''مقالات وفتاویٰ'' کے اس مجموعے میں اس کی گو کہ گنجائش نکالی جا سکتی ہے مگر فنی اعتبار سے قابلِ تحسین نہیں۔

③ - مضامین کی ترتیب پر بھی توجہ دینے کی ضرورت ہے۔

حاصل کلام مجموعہ مقالات کی صنف میں یہ کتاب بہت عمدہ اور ایک ثمین اضافہ ہے۔

مفکر اسلام حضرت مولانا
محمد اسحاق صدیقی سندیلوی
حیات و آثار

حافظ محمد عبد المقیت

صفحات: ۴۹۳ مجلد

ناشر: عظمت رفتہ نشر و اشاعت، پاکستان

برائے حصولِ کتاب: مکتبہ رحمۃ اللعالمین، پشاور

۰۳۱۴۵۵۲۹۳۲۹، ۰۳۴۰۷۴۹۶۵۳۴

مولانا محمد اسحاق صدیقی ندوی سندیلوی ماضی قریب کے مشہور عالم، مدرس اور مصنف تھے۔ ندوہ کے فاضل بھی تھے اور انھیں اپنی مادرِ علمی میں تدریس کے فرائض انجام دینے کی سعادت بھی حاصل ہوئی۔ اس کے علاوہ مدرسہ فرقانیہ لکھنؤ اور مدرسہ قاسم العلوم مراد آباد جیسے علمی گہواروں سے بھی مستفید ہوئے۔ مولانا اشرف علی تھانوی سے بیعت و ارشاد کا تعلق قائم کیا اور ان کے خلفاء سے مستفید ہوئے۔ تقسیم ہند کے بعد جامعۃ العلوم الاسلامیہ بنوری ٹاؤن کراچی، اور جامعہ مدینۃ العلوم کراچی سے منسلک رہے۔ انھیں تدریس اور افتا دونوں میں مہارت تھی۔ وہ ۱۹۱۳ء میں محلہ کٹرہ ابو تراب لکھنؤ میں پیدا ہوئے، دسمبر ۱۹۷۰ء میں تقدیر الٰہی کا سفر انھیں کراچی لے آیا اور یہیں ۱۹۹۵ء میں ان کی وفات ہوئی۔

مولانا کی شخصیت میں تنوع تھا اور ان میں گوناگوں اوصاف جمع ہو گئے تھے۔ ایک عالم، مدرس، مفتی اور مصنف ہونے کے ساتھ ساتھ سند یافتہ طبیب بھی تھے۔ ''منبع الطب کالج'' لکھنؤ سے طب کی تحصیل کی۔ شعر وسخن کا بھی ذوق تھا، شہید تخلص فرماتے تھے اور اس فن میں خواجہ عبد الرؤف عشرت لکھنوی کے شاگرد تھے۔ مجاہدانہ ذوق و صفات سے بھی آراستہ تھے، ریاست بھوپال کے فوجی اسکول سے باقاعدہ عسکری تربیت لی تھی۔ فتنہ سبائیت کی تردید میں بہت زیادہ ساعی تھے۔

افسوس مولانا کی کوئی صلبی یادگار نہیں تاہم ان کی دو درجن سے زائد کتابیں اور مختلف علمی و دینی رسائل و جرائد میں منتشر مضامین ان کی زندہ یادگار ہیں۔

ان کی ایک اہم کتاب ''اسلام کا سیاسی نظام'' ہے، یہ کتاب اسلامی ریاست کے دستوری خاکے کے طور پر لکھی گئی ہے۔ اردو میں اپنی نوعیت کی پہلی کتاب ہے۔ ان کی دیگر اہم کتابوں میں ''دینی نفسیات''،

"مسئلہ ختم نبوت علم و عقل کی روشنی میں"، "تجدید سبائیت"، "اظہارِ حقیقت" وغیرہا شامل ہیں۔

کتاب کے فاضل مولف نے اس کتاب کے ذریعے ایک اہم علمی خدمت انجام دی۔ تاہم بحیثیت سوانح نگار مولانا کی زندگی کے جو مشکل مقامات تھے ان سے صرفِ نظر کر کے گزر گئے ہیں۔ مولف نے "عافیت پسندی" کے ساتھ کتاب تالیف فرمائی ہے۔ بنوری ٹاؤن سے مولانا کا انقطاع اپنا ایک پس منظر رکھتا ہے مولف نے اس پر کوئی اشارہ نہیں کیا۔ اسی طرح ان کے بعض نظریات پر اہل علم کے اختلاف کا ذکر اور ان کی کتابوں پر باقاعدہ تبصرے سے گریز کیا ہے۔ مولانا کی کتاب "دینی نفسیات" ۱۹۷۶ء میں مولانا سید یوسف بنوری کے اشراف میں شایع ہوئی تھی۔ پھر مصنف کی وفات کے بعد ۱۹۹۷ء میں دوبارہ طبع ہوئی تو اس میں ایک باب کا اضافہ تھا جس میں عقیدہ نزول مسیح پر بحث کی گئی تھی اور اسے کتاب وسنت کے خلاف قرار دیا گیا تھا کہ بقول مصنف اس سے عقیدہ ختم نبوت پر زد پڑتی ہے۔ بعض حلقوں کے مطابق یہ باب الحاقی ہے (ملاحظہ ہو: ماہنامہ "بینات"، کراچی: اپریل ۲۰۲۴ء)۔ تاہم مولف کتاب یہاں صرف یہ لکھ کر گزر گئے:-

"دینی نفسیات کے سلسلہ میں مولانا مرحوم نے حیاتِ مستعار کے آخری ایام میں مزید ابواب/ فصول سپردِ قلم فرمائے، جس دن یہ کامل مکمل کیا اسی روز شب میں اللہ کو پیارے ہوئے۔" (ص: ۱۵۷)

تاہم کتاب کے مطالعے سے مولانا کی بھرپور زندگی اور ان کے اپنے افکار و خیالات کی جھلک کسی درجے میں نمایاں ہو جاتی ہے؛ بالخصوص فتنہ سبائیت اور اسلامی نظام کے قیام کے حوالے سے۔

مولانا نے فتنہ سبائیت اور اس کے بال و پر یعنی رفض و تشیع کی بھرپور خبر لی۔ اسی ذیل میں وہ مولانا مودودی اور جماعت اسلامی سے بھی سخت متنفر رہے۔ ان کے مطابق مولانا مودودی اہل سنت و الجماعت سے خارج اور گمراہ تھے۔ (ص: ۱۹۸)

مولانا کی علمی، فکری و سیاسی افکار و نظریات کی ایک جھلک جو زیر تبصرہ کتاب سے برآمد ہوتی ہے، ملاحظہ فرمائیے:-

❁- "یہ کہنا بھی غلط ہے کہ ہمارے اور شیعوں کے درمیان اختلافات فروعی ہیں جو شخص شیعہ مذہب سے واقف اور اہل سنت سے باخبر ہے وہ کبھی ایسی بات کہنے کی جرأت نہیں کر سکتا۔" (ص: ۱۹۸)

❁- "فقہ القرآن (از عمر احمد عثمانی) پر تنقید کا سلسلہ شروع کیا تھا جو سر دست ملتوی ہے مگر عن قریب ان شاء اللہ شروع ہو جائے گا۔" (ص: ۲۱۲) معلوم نہیں اس کا کیا ہوا؟

❁- "لغتاً "آل" کے معنی ذریت و اولاد نہیں بل کہ "مایؤول الیہ الامر" یعنی حامی، ناصر، متبع کو کہتے ہیں۔ اگرچہ اس معنی کی وسعت میں ذریت بھی داخل ہو جاتی ہے۔ یہی معنی درود شریف میں مراد ہیں اور اس معنی میں اصحاب و ازواج وغیرہ سب داخل ہیں اور درود شریف میں ان سب کے لیے دعائے رحمت کی جاتی ہے۔" (ص: ۲۲۴)

❁- "قرآن، سنت اور اصحاب کو ماننے والے بریلوی، دیوبندی، اہل حدیث سب لوگ اہل سنت والجماعت ہیں۔" (ص: ۴۰۵)

❁- "ایران دوسرا اسرائیل اور اسرائیلِ سابقہ کا چہیتا فرزند ہونے کے علاوہ روس کا غلام ہے۔ روس، ایران کے لیے بلوچستان مانگنے کے درپے ہے۔" (ص: ۴۲۰)

❁- "قسم قسم کے شرکیہ اعتقادات بہ کثرت پھیلے ہوئے ہیں۔ میں نے "نورِ حیات" میں اس پر لکھا ہے۔ جب تک فاسد عقائد نکالے نہیں جاتے اس وقت تک کمالِ ایمان حاصل نہیں ہو سکتا۔" (ص: ۴۲۸)

❁- "اس وقت ایک فکری جنگ بپا ہے اس کے لیے کمالِ ایمان کے حاصل کرنے کی ضرورت ہے۔ ہم کن حالات سے گزر رہے ہیں؟ دین کے لیے کس طرح خطرات ہیں؟ اس کا احساس ہونا چاہیے، جب احساس ہوگا تو دوسری چیزیں آسانی سے سمجھ آتی جائیں گی۔" (ص: ۴۳۰)

❁- "دشمنانِ دین کا ایک حربہ یہ ہے کہ غیر اسلامی تہذیب و ثقافت کی خوبیاں بیان کر کے اسلامی تہذیب کو نظروں سے گرانے کی کوشش کرتے ہیں مگر پوری احتیاط ملحوظ رکھتے ہیں کہ اسلامی عقائد پر کوئی اعتراض نہ کیا جائے تاکہ مسلمانوں کے جذبات کو ٹھیس نہ لگے۔ رفتہ رفتہ جب غیر اسلامی تہذیب و ثقافت رائج ہو جاتی ہے اور مسلمان اسے اسلامی تہذیب و ثقافت پر ترجیح دینے لگتا ہے تو اصول اسلام میں شک و شبہ پیدا کر دینا کوئی مشکل کام نہیں رہتا۔" (ص: ۴۳۳)

❁- "عالم اسلام کے فتنے الحاد، رفض، قادیانیت، وطنیت وغیرہ سبھی خطرناک ہیں، البتہ ان تمام فتنوں میں سب سے زیادہ ہمہ گیر اور وسعت پذیر جو فتنہ ہے وہ الحاد ہے۔ الحاد ہی درحقیقت تمام فتنوں کی جڑ ہے۔" (ص: ۴۳۷)

❁- "اس امت کی بقاء اس کے عقیدہ ختم نبوت سے وابستہ ہے، اگر یہ عقیدہ نہ ہوتا تو یہ امت بھی باقی نہ رہتی۔" (ص: ۴۴۲)

❁- "دنیا میں جنگ ہمیشہ نظریات و افکار کی ہوتی ہے۔ شکست خوردہ وہ ہے جو اپنے افکار و نظریات کو دوسرے کے افکار و نظریات میں جذب کر دے اور فاتح وہ ہے جس کے افکار غالب ہوں۔" (ص: ۴۶۱)

❁- "دنیا کے سیاسی نظریوں میں جس قدر پُر فریب اور پُر تلبیس نظریہ جمہوریت ہے اس قدر کوئی بھی نہیں۔" (ص: ۴۷۸)

کتابت کی اغلاط گو کم ہیں تاہم بعض مقامات پر قاری کو سخت بے مزہ کرتی ہیں۔ کتاب ماضی قریب کے ایک جید عالم و مفکر کی سوانح و افکار سے متعلق ہے۔ اپنے موضوع پر اولین کاوش ہونے کی وجہ سے بہت مفید اور لائق مطالعہ ہے۔ کتاب میں مولانا کی بعض نادر تحریریں، مکاتیب بھی جمع ہو گئے ہیں۔

❁ ❁ ❁ ❁ ❁ ❁